الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

آپ کے کمرہ کی دیوار پر جو کیلنڈر ہے، اس پر ۱۹۷۷ کا سنہ لکھا ہوا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ کیلنڈر کے اوپر ۲۰۷۷ کا سنہ لکھا ہوا نظر آئے تو اس کے لئے آپ کو پوری ایک صدی تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک خود ساختہ کیلنڈر پر آپ جو ہندسہ چاہیں اپنے ہاتھ سے لکھ لیں۔ مگر وہ کیلنڈر جو دنیا کے نزدیک بھی کیلنڈر ہو، اس پر ۲۰۷۷ کا ہندسہ دیکھنے کے لئے سو سالہ انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس دنیا میں کیلنڈر کے لئے جو قانون ہے، وہی ملی تعمیر کا بھی قانون ہے، نعروں اور جوشیلی تقریروں میں ملت کا مستقبل دیکھنا ہو تو کسی بھی صبح و شام لفظوں کا سیلاب بہا کر اس قسم کا ایک خیالی محل کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقی مستقبل کی تعمیر طویل جد و جہد کے بغیر ممکن نہیں۔

شمارہ ۶	زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے۔ فی پرچہ دو روپیہ	اپریل ۱۹۷۷

خصوصی تعاون سالانہ: کم سے کم ایک سو ایک روپیہ

فہرست

صحفي هندي يكتب :

ملاحظات عن ليبيا والعقيد القذافي

نشرت مجلة الرسالة الشهرية الهندية بقلم المفكر الهندي وحيدالدين خان مقالا عن انطباعاته عن زيارته لليبيا التي زارها في شهر فبراير لحضور ندوة الحوار الاسلامي المسيحي .

وبعد ذكر انطباعاته بتفصيل عن ندوة الحوار كتب يقول :

في مساء ٣ فبراير ١٩٧٦ كان نحو خمسمائة مسلم ومسيحي مجتمعين في مسرح التحرير بطرابلس حين توقفت الحركة فجاة وهرع بعض الناس نحو الباب واخذ المصورون بالاتهم الثقيلة يلتقطون الصور فعرفنا ان الرئيس الليبي العقيد معمر القذافي قد حضر الندوة فجاة .. وحاول بعض الناس ان ياخذوه الى المنصة ، ولكنه جلس

البقية ص ٧

صحفي هندي ـ بقية

على مقعد شاغر مع الناس واخذ ينصت للكلمات التي تلقى في الندوة كان ذلك رجلا نحيلا ونحيفا بدون قبعة على راسه وكان يلبس بدلته عادية بدون رابطة عنق وكان خاليا من اية علامة تدل عليه وكان يجلس بصمت على كرسيه كاي شخص اخر .

واستمرت الكلمات تلقى في الندوة .. وبعد انتهاء فترة من الندوة ، ذهب القذافي الى المنصة بسبب اصرار الناس ، ولم يجلس هناك على كرسي الرئيس بل جلس على كرسي عاد .. وخلال وجوده ذلك المساء تحدث ثلاث مرات عندما طلب الناس ، وكلماته الثلاثة كانت بسيطة وبدات بدون تمهيد وانتهت ايضا كذلك .

وفي ٦ فبراير التقيت بمعمر القذافي ، فقال لي من فوره :

لقد قرات كتابك .. الاسلام يتحدى .

وقال انه ـ كتاب عظيم ـ وقدمني الى احد مرافقيه يقول : هو مفكر ومؤلف كبير ونحن نقدره ..

ان العقيد القذافي شخص في منتهى البساطة . ولا يبدو لك حين تراه انه يحكم دولة نفطية .

وفكرت .. ما هي الميزة التي اوصلت هذا الشخص البسيط الى مقامه هذا ؟ واجبت بنفسي .. انها ميزة تقبل المخاطرة ـ ففي ليلة الفاتح من سبتمبر ١٩٦٩ حين خرج هذا الضابط مع زملائه من معسكر قار يونس الى بنغازي ، كانت كل لحظة تمثل لهم خطر الموت .. وان كان الملك السابق ادريس في تركيا في ذلك الوقت ، الا ان قوات امنه ، المزودة بالطائرات ، كانت قادرة على القيام باي اجراء ، ولكن القذافي تقبل المخاطرة واستولى على محطة الاذاعة ليعلن للشعب الليبي : قامت قواتك المسلحة بالاطاحة بالنظام الرجعي المتخلف المتعفن ، وهكذا من الان تعتبر ليبيا جمهورية حرة ذات سيادة تحت اسم الجمهورية العربية الليبية .

وانتهى المقال بتفاصيل اخرى عن ندوة الحوار الاسلامي المسيحي .

الرسالہ کا ذکر عربی اخبارات میں

امریکی ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ ۱۳ زبانوں میں چھپتا ہے اور دنیا بھر میں اس کی ۲۹ ملین سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوتی ہیں آج ایک دینی اور اصلاحی پرچے کے لئے اس سے بھی زیادہ شان دار امکانات ہیں ۔ بشرطیکہ جاننے والے اس کو جانیں اور کرنے والے اس کو کریں ۔

لیبیا کے روزنامہ الجہاد (طرابلس) نے اپنی اشاعت ۷ جنوری ۱۹۷۷ میں الرسالہ کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے "ہندستان کے ماہنامہ الرسالہ نے ہندی مفکر وحیدالدین خاں کا ایک مقالہ شائع کیا ہے جس میں انھوں نے اپنے لیبیا کے سفر کے تاثرات بیان کئے ہیں ۔ وہ پچھلی فروری میں مسلم ۔ کرسچین ڈائیلاگ میں شرکت کے لئے یہاں آئے تھے ۔

"کانفرنس کے بارہ میں اپنے مفصل تاثرات تحریر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں" اس کے بعد الرسالہ ماہ اکتوبر ۱۹۷۶ کے صفحہ ۵۵ کالم ۲، اور صفحہ ۵۷ کالم ۱ ۔ ۲ کا مضمون نقل کیا ہے جس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے ۔

(ظفرالاسلام خاں)

رائے قائم کرنے سے پہلے تحقیق کیجئے

قرآن میں اجتماعی زندگی کے بارے میں جو احکام دیئے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

یا ایہا الذین آمنوا اذا جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجہالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین (حجرات۔ ۶)

اے ایمان لانے والو، اگر تمھارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کے اوپر نادانی سے جا پڑو، پھر اپنے کیے پر تم کو پچھتانا ہو

یہ ایک نہایت اہم ہدایت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خبر لانے والا ناقص خبر لاتا ہے۔ سننے والا اگر اتنے ہی سے رائے قائم کرلے تو وہ ضرور غلط فہمی میں پڑ جائے گا اور اس کی بنیاد پر کوئی اقدام کرے تو شدید امکان ہے کہ وہ ایک شخص کو بے قصور سزا دینے کا مجرم بن جائے۔ اس لئے جو دل خدا سے ڈرتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ سنی ہوئی باتوں کی تحقیق کرے۔ خاص طور پر وہ بات جو کسی کے خلاف ہو، اس کو تو بلا تحقیق مان لینا شدید ترین قسم کا اجتماعی گناہ ہے۔ ایسی حرکت وہی کر سکتا ہے جس کا دل خدا کے خوف سے خالی ہو۔ یا اس کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی بڑائی کا جھوٹا احساس پیدا ہو گیا ہو، وہ سمجھنے لگا ہو کہ اگر میں نے کسی کے خلاف بے قصور کارروائی کر دی تو وہ میرا کیا بگاڑ لے گا۔

یہاں چند واقعات درج کئے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک خبر بظاہر صحیح، مگر حقیقتہً بالکل غلط ہو سکتی ہے۔

۱۔ صحیح بخاری میں عبادہ بن الصامت سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے نکلے کہ ہم کو لیلۃ القدر کے بارے میں بتا دیں کہ وہ کب ہوتی ہے۔ اس اثنا میں دو مسلمان لڑ پڑے۔ پس اس کا علم اٹھا لیا گیا (فرفعت) اس سے شیعہ حضرات نے یہ استدلال کیا ہے کہ لیلۃ القدر صرف ایک بار ہوئی تھی۔ اب وہ ہمیشہ کے لئے اٹھالی گئی ہے۔ بظاہر حدیث کے لفظ "فرفعت" کو دیکھتے ہوئے ان کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کے آگے کے الفاظ اس خیال کی تردید کر دیتے ہیں کیونکہ آگے ارشاد ہوا ہے:

وعسی ان یکون خیرا لکم فالتمسوھا فی التاسعۃ والسابعۃ والخامسۃ

ممکن ہے اس میں تمھارے لئے بہتری ہو۔ اس لئے اس کو رمضان کی نویں شب، ساتویں شب اور پانچویں شب میں تلاش کرو

یہ فقرہ بتاتا ہے کہ "رفعت"، سے مراد یہ ہے کہ اس کی تعیین کا علم اٹھا لیا گیا نہ کہ خود لیلۃ القدر کا وجود ختم کر دیا گیا۔

۲۔ امام ابو حنیفہؒ ایک باغ سے گزرے وہاں کچھ عورتیں گانا گا رہی تھیں۔ ابو حنیفہؒ کو دیکھ کر وہ چپ ہو گئیں۔ انھوں نے فرمایا قد احسنتن (تم نے اچھا کیا) کچھ لوگوں نے جو ساتھ تھے آپ کو ملامت کی کہ آپ غناء کی تحسین کر رہے ہیں۔ یہ تو معصیت الہٰی کے کام کی حوصلہ افزائی ہے۔

بظاہر یہ اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مگر جواب

دیکھئے تو بات بالکل بدلی ہوئی نظر آئے گی۔ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا: جب وہ گا رہی تھیں تب میں نے احسنت کہا یا جب وہ خاموش ہوگئیں تب کہا۔ لوگوں نے جواب دیا جب وہ خاموش ہو چکی تھیں تب کہا۔ آپ نے فرمایا:

اللہ اکبر، اردت احسنتن فی السکوت لا فی الغناء

میں نے ان کے سکوت کی تحسین کی نہ کہ ان کے غنا کی۔

۳۔ ماہنامہ الوعی الاسلامی (کویت) کے ایک مضمون پر اعتراض کرتے ہوئے اس کے ایک قاری نے لکھا:

لقد ذکرتم فی جوابکم علی خطاب احد القراء فی مجلة الوعی الاسلامی العدد الصادر فی اول جمادی الاولی ۱۳۸۶ھ ان الخلافة (الاسلامیة) موضوع تاریخی لا یمکن ان یکون له صلة بحاضرنا

اپنے رسالہ کے ایک قاری کے خط کا جواب دیتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ خلافت (اسلامی) ایک تاریخی موضوع ہے۔ ہمارے موجودہ حالات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اس کے بعد مکتوب نگار نے ایڈیٹر کو لکھا کہ یہ آپ کا جہل ہوسکتا ہے یا تجاہل۔ ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ خلافت ایک حکم شرعی ہے۔ مسلمانوں میں اس پر تو اختلاف رائے ہے کہ خلیفہ بنانے کا مستحق کون ہے۔ مگر اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خلیفہ کا نصب واجب ہے۔

بظاہر یہ اعتراض بہت صحیح معلوم ہوتا ہے، مگر جواب پڑھئے تو وہ بالکل بے بنیاد نظر آئے گا۔ رسالہ کے ایڈیٹر نے جواب میں لکھا کہ ہم نے جس خط کے جواب میں یہ بات لکھی تھی اس میں خلافت کا اصولی مسئلہ زیر بحث نہ تھا، بلکہ صرف یہ سوال تھا کہ دور اول میں خلافت حضرت ابوبکر کا حق تھا یا حضرت علی کا۔

فالکلام اذن صریح فی انه کان عن موضوع: من احق بالخلافة، ابوبکر ام علی۔ لا علی موضوع الخلافة نفسها

پس واضح ہے کہ یہ گفتگو اس موضوع پر تھی کہ آنحضور کی وفات کے بعد خلافت کے عہدہ کے مستحق ابوبکر تھے یا علی۔ نفس خلافت کا مسئلہ اس میں زیر بحث ہی نہ تھا۔

ایڈیٹر نے لکھا کہ اس مسئلہ پر آج بحث کرنا بے فائدہ ہے۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ اب ہم کیوں اس بحث میں پڑیں۔ اب تو آج کی خلافت پر گفتگو ہونی چاہئے نہ کہ ماضی کی خلافت پر۔ (الوعی الاسلامی، کویت، اکتوبر ۱۹۶۶)

کوئی شخص جتنی بلندی پر اپنے آپ کو کھڑا کرے اتنا ہی دور تک کا منظر اسے دکھائی دے گا، اسی طرح فہم قرآن کے بھی درجے ہیں۔ کسی شخص کے اوپر کتاب الٰہی کے وہی معانی کھلتے ہیں جن کے لئے اس نے اپنے آپ کو اہل بنایا ہو۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اُنزل القرآن علی سبعة احرف، لکل آیة منها ظهر و بطن ولکل حد مُطّلع

(مشکواۃ، کتاب العلم)

قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے۔ اس کی ہر آیت کا ایک اوپر ہے اور ایک اندر ہے اور ہر حد تک دیکھنے کی ایک جگہ ہے۔

زندگی کا رخ

آخرت کی طرف ہو جائے

AKHIRAT ORIENTED LIFE
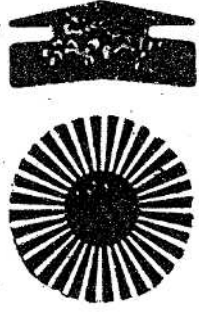
غزوہ ذات السلاسل کا واقعہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن العاصؓ کو لشکر کا سردار مقرر کیا۔ مگر پورا لشکر بیک وقت تیار نہ تھا۔ آپ نے عمرو بن العاصؓ کو ایک دستہ کے ساتھ پہلے روانہ کر دیا۔ اس کے بعد دو سو مہاجرین و انصار کے ساتھ دوسرا دستہ تیار ہوا اور ابو عبیدہؓ بن الجراح کی سرداری میں روانہ ہوا۔ ان کو جھنڈا دیتے ہوئے آپ نے ان کو جو نصیحتیں کیں، ان میں سے ایک یہ تھی: جب تم اپنے ساتھی (عمرو بن العاصؓ) سے ملو تو تم دونوں مل کر کام کرنا، اختلاف مت کرنا (اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا)

ابو عبیدہؓ کا دستہ جب مدینہ سے چل کر عمرو بن العاصؓ کے پاس پہنچا تو نماز کا وقت آگیا تھا۔ صفیں کھڑی ہوئیں، ابو عبیدہؓ نے چاہا کہ امامت کریں۔ عمرو بن العاصؓ نے اس سے اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا آپ میری مدد کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ یہ صحیح نہیں کہ آپ میری امامت کریں جب کہ اصل امیر میں ہوں۔ ابو عبیدہؓ کے دستہ کے لوگ، جن میں ابو بکرؓ و عمرؓ بھی تھے، نے کہا کہ عمرو بن العاصؓ اپنے دستہ کے امیر ہیں اور ابو عبیدہؓ اپنے دستہ کے۔ عمرو بن العاصؓ نے اس تقسیم سے اتفاق نہیں کیا، اور کہا: تم لوگ میری مدد کے لئے بھیجے گئے ہو، پس میں ہی قائد ہوں (انما انتم امددت بکم فانا القائد)

اس کے بعد ابو عبیدہؓ بن الجراح نے اپنا حق واپس لے لیا، اور کہا: رسول اللہؐ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ تم عمرو بن العاصؓ سے ملو تو جھگڑا مت کرنا، اتفاق کے ساتھ کام کرنا: وانك واللہ ان عصیتنی لاطعتك خدا کی قسم اگر تم میری بات نہ مانو تب بھی میں تمھاری اطاعت کروں گا۔

یہ میدان ابھی تک خالی ہے

مغربی دنیا میں طبیعی دنیا کی طرف سے مایوسی نے کثیر تعداد میں ایسے لوگ پیدا کر دیئے ہیں جو سائنسی طور پر دماغی قوتوں کی تلاش کر رہے ہیں۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف برین ریسرچ اس کی ایک مثال ہے۔ حتیٰ کہ تخلیقی ذہانت (CREATIVE INTELLEGENCE) موجودہ زمانہ میں ایک مستقل سائنس بن گئی ہے۔ یہی وہ ذہنی زمین ہے جس نے ہندستانی یوگیوں کو موقع دیا ہے کہ وہ مغرب میں اپنے بہت سے شاگرد پا سکیں۔ تاہم اس کے علاوہ اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانہ پر ایک اور تلاش جاری ہے۔ یہ ہے دور سائنس کے لئے ایک مذہب کی تلاش۔ آخری حقیقت کیا ہے، مرنے کے بعد انسان کہاں جاتا ہے، مادی دنیا کے ماورا اگر کوئی دنیا ہے تو وہ کیا ہے اور کہاں ہے۔ ان سوالات کا جواب دینے کا میدان ساری دنیا میں ابھی تک خالی ہے۔ دین حق کے حاملین کو موقع ہے کہ اس اہم رول کو ادا کر کے یہاں اپنی جگہ بنا سکیں۔

"محسوس مادہ ہی سب کچھ ہے" یہ نظریہ دو سو برس تک علمی دنیا کو مسحور رکھنے کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مسلسل ایسے شواہد سامنے آئے جنھوں نے انسان کو مجبور کیا کہ وہ غیر مادی حقائق کو بھی تسلیم کرے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی جدید ذہنی نظریات ہیں جنھوں نے اقرار کیا ہے کہ دماغ پر اسرار طاقتوں کا خزانہ ہے اور دماغی لہروں کے ذریعہ خارجی چیزوں پر اسی طرح اثر انداز ہونا ممکن ہے جس طرح مادی چیزوں کے ذریعہ اس کو یقینی سمجھا جاتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس سلسلے میں امریکہ، انگلستان اور ندرلینڈ وغیرہ میں کثیر تحقیقات ہوئی ہیں اور اب بھی بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہیں۔

ان حالات نے ہندوستان کے یوگیوں کو موافق زمین فراہم کی ہے کہ وہ مغربی دنیا میں داخل ہوں اور اپنے قدیم فن کو نئے عنوانات کے ساتھ لوگوں میں مقبول بنائیں۔ ان کی کوششوں سے مغربی دنیا، خاص طور پر امریکہ میں ایک نئی "سائنس" وجود میں آگئی ہے جس کو ماورائی مراقبہ (TRANSCENDENTAL MEDITATION) یا مختصر طور پر ٹی ایم (TM) کہتے ہیں۔ اس سائنس کو مغربی دنیا میں پھیلانے کے لئے ہندوستان کے یوگی بہت بڑی تعداد میں یورپ اور امریکہ میں کام کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سو سے زیادہ ہندو جماعتیں صرف امریکہ میں متحرک ہیں۔ ایک جائزہ کے مطابق ۱۹۵۸ سے لے کر ۱۹۷۴ تک ساڑھے سات لاکھ لوگوں نے ٹی۔ ایم کی تربیت حاصل کی۔ امریکہ میں ان کی تعداد میں ہر ماہ تقریباً ۲۰ ہزار مردوں اور عورتوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ہندو سوامیوں کے امریکہ میں اتنے بڑے بڑے ادارے ہیں جن کے اپنے ہوائی اور سمندری جہاز ہیں۔ مہارشی انٹرنیشنل یونیورسٹی کے نام سے آئیووا (امریکہ) میں ایک باقاعدہ جامعہ قائم ہو گئی ہے۔ سویڈن میں ٹی ایم کے طلبہ کو سرکاری فنڈ سے امداد دی جاتی ہے۔ مستند سائنس جنرل مثلاً سائنٹفک امریکن، امریکن جنرل آف فزیالوجی

وغیرہ نے پچھلے چار برسوں میں تقریباً ڈیڑھ سو مقالات شائع کئے ہیں جن میں ٹی ایم کے اثرات کا اقرارانسانی عضویات (HUMAN PHYSIOLOGY) پر کیا گیا ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۸ کے آخری ہفتہ میں ۲۶ ویں انٹرنیشنل کانگریس آف فزیالوجیکل سائنسز کا اجلاس نئی دہلی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر دنیا بھر کے سائنس دانوں کی بڑی تعداد جمع ہوئی۔ یہ اجتماع اتنے بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا کہ اشوکا ہوٹل میں اس کی کارروائیوں کے لئے گیارہ کانفرنس روم مخصوص کرنے پڑے۔ آنے والوں میں متعدد وہ لوگ بھی تھے جو اس ہندستانی سائنس سے متاثر ہیں۔ مثلاً مہارشی انٹرنیشنل یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر آر۔ کے۔ ویلیس (R.K. WALLACE) اور ڈاکٹر لارنس ڈومیش (LAWRENCE DOMASH) وغیرہ۔

کہا جاتا ہے کہ انسانی دماغ میں بے پناہ ایسے مزید امکانات چھپے ہوئے ہیں جن کا عام انسان کو تجربہ نہیں ہوتا۔ ٹی ایم ان امکانات میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ عام طور پر انسان اپنے دماغ کو صرف پانچ فی صد تک استعمال کر پاتا ہے۔ مگر ٹی ایم کے ذریعہ یہ ممکن ہے کہ اس کو صد فی صد استعمال کیا جاسکے۔ اپنی دماغی قوت کو کام میں لاکر ایک شخص اپنے سر درد کو دور کرسکتا ہے۔ اور بلڈ پریشر کو تبدیل کرسکتا ہے۔ دماغ اور کمپیوٹر کے درمیان ریڈیائی مواصلات قائم کئے جاسکتے ہیں۔ ٹی ایم کے ذریعہ دوران خون کے نظام، تنفس کے نظام، جسمانی ٹمپریچر کے نظام، تحلیل غذا کے نظام کو متاثر کیا جاسکتا ہے۔ تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ تربیت یافتہ یوگی اپنے جسم کے ایک حصہ کا ٹمپریچر اس طرح بدل سکتا ہے کہ دوسرے حصہ کا ٹمپریچر تبدیل نہ ہوا ہو۔ وہ پانی کی غیر معمولی مقدار جسم میں داخل کرکے اس کو ہضم کرسکتا ہے یا فنے کے ذریعہ خارج کرسکتا ہے، بعض لوگوں کو ایر ٹائٹ کرٹھے میں لمبی مدت کے لئے بند کردیا گیا اور دیکھا گیا کہ وہ عام انسان کے مقابلہ میں ۵۰ فی صد کم آکسیجن پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ نوبل انعام یافتہ برائن جوزف سن (BRIAN JOSEPHSON) نے کہا ہے کہ ٹی ایم کے ذریعہ دماغی توازن پر کنٹرول کیا جاسکتا ہے اور اس طرح غم اور تناؤ سے بچا جاسکتا ہے۔ ٹی ایم کی طرف سائنس دانوں کی توجہ کی خاص وجہ جیسا کہ ڈاکٹر ڈومیش نے کہا ہے، یہ ہے کہ اس کی تعلیم یکساں طور پر ساری دنیا میں دی جاسکتی ہے اور تحقیقات کے جدید سائنسی طریقوں کے ذریعہ اس کا تجربہ کیا جاسکتا ہے۔

ٹی ایم کی اس مقبولیت کو دیکھ کر اس کے بعض پرجوش داعی یہ کہنے لگے ہیں کہ مستقبل کے انسان کا مذہب ہندوازم یا ویدانت ہوگا تاہم ابھی وہ یہ نہیں بتا سکے ہیں کہ ٹی ایم اپنی موجودہ یا آئندہ کی متوقع کامیابیوں کے باوجود، کس طرح اس سوال کا جواب ہے جس کے لئے انسان قدیم ترین زمانہ سے ایک مذہب کی تلاش کرتا رہا ہے۔

۱۔ ٹی ایم اپنی نوعیت کے اعتبار سے کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ وہی چیز ہے جس کو مسلم صوفیاء اور دیگر مذاہب کے درویش ذہنی ریاضتوں کے ذریعہ مختلف زمانوں میں حاصل کرتے رہے ہیں۔ ہندوستانی یوگیوں اور سادھوؤں نے بلاشبہ اس فن میں خصوصی کارنامے دکھائے ہیں۔ مگر اس طریقہ کے آخری ممکن استعمال کے بعد بھی انسان کو جو چیز ملتی ہے وہ صرف انسان کی مادی قوتوں میں بعض ذہنی قوتوں کا اضافہ ہے ــ یہ زیادہ سے زیادہ بس مادی سائنسوں کی ایک توسیع ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ انسان جو اب تک صرف مادی تدابیر کے ذریعہ اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا، وہ اپنی دماغی لہروں یا اپنی ارادی قوت سے بھی خارجی اشیاء پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرنے لگے

مگر انسانی قوت کی یہ توسیع اس سوال کا جواب نہیں ہے جس کے لئے انسان ایک مذہب یا اخلاقی نظام کی تلاش کر رہا ہے۔ یہ مسئلہ انسان کی ارادی قوت کی توسیع کے بارے میں نہیں بلکہ اس کو کنٹرول کرنے کے بارہ میں ہے مذہبی نقطۂ نظر سے اصل سوال یہ ہے کہ وہ انسانی ارادہ جو کبھی مادی بٹن اور کبھی اپنی دماغی لہروں کو استعمال کر کے خارجی دنیا پر اثر انداز ہوتا ہے خود اس ارادہ کو کس طرح نظم و ضبط کے دائرہ میں لایا جائے۔ ایٹمی ملکوں کے وزراء جنگ اگر اپنی دماغی لہروں یا اپنی قوت ارادی کے ذریعے اپنے راکٹوں اور بمبار جہازوں کو متحرک کرنے لگیں تو اس سے اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ دنیا کو ایسے وزراء جنگ سے کس طرح بچایا جائے جو یہ طاقت رکھتے ہیں کہ چند گھنٹوں کے اندر ساری آباد دنیا کو خاکستر بنا دیں۔

۲۔ مذہبی یا فلسفیانہ اعتبار سے دوسرا مسئلہ جو انسانیت کے سامنے درپیش ہے، وہ یہ کہ اگر اس کائنات میں کوئی ایسی آخری حقیقت ہے جو انسان سے ماوراء ہے، تو انسان سے اس کا کیا تعلق ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک علمی دنیا میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ انسان سے بالاتر اس کائنات میں کوئی حقیقت نہیں۔ مگر موجودہ صدی میں ایسے کثیر شواہد سامنے آئے ہیں جو انسان یا کائنات کو آخری حقیقت تسلیم کرنے میں مانع ہیں اور اگر براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر یہ قرینہ پیدا کرتے ہیں کہ اس عالم میں انسان سے بلند تر بھی کوئی حقیقت ہے۔ اس قرینہ کی وجہ سے یہ سوال شدت کے ساتھ انسان کے سامنے آگیا ہے کہ وہ اپنے اور اس آخری حقیقت کے درمیان تعلق کو دریافت کرے۔ یہی وہ سوال ہے جس نے جدید انسان کو دوبارہ مذہب کے مطالعہ کی طرف مائل کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ٹی ایم کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ انسان اور انسان کے درمیان ایک مخفی رشتہ کی دریافت ہے انسان اور خدا کے درمیان رشتہ کو دریافت کرنا اس کے حدود عمل سے باہر ہے۔ نہ وہ اس کا مدعی ہے نہ اب تک ایسا کوئی قرینہ سامنے آیا ہے کہ اس سے یہ امید کی جا سکے کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان رشتہ کو دریافت کر کے مذہب کو غیر ضروری چیز ثابت کر دے گا۔

●●●●●●●●●●●●●●

جنوب مغربی سمت سے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھائی کرنا اب تک بہت مشکل سمجھا جاتا تھا۔ اگست ۱۹۷۵ میں پہلی بار اس کو ایک برطانوی ٹیم نے سر کیا جس کے قائد کرس بونگٹن تھے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانوی ٹیم کی اس کامیابی کا اہم سبب ایک برطانوی فرم کی ایک ایجاد تھی۔ اس نے بہت ہلکے وزن کے آکسیجن سلنڈر بنائے۔ ان سلنڈروں کے ذریعہ یہ ممکن ہوگیا کہ ایک سو لیٹر آکسیجن ایک ایسے سلنڈر میں رکھا جا سکے جس کا وزن صرف ۳ر۴ کیلوگرام ہو۔ یعنی تقریباً نہیں کے برابر۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی زندگی میں کس طرح ایک شعبہ میں کچھ لوگوں کے آگے بڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے شعبوں میں کچھ دوسرے لوگ آگے بڑھے ہوئے ہوں۔ جس قوم میں سارے لوگ صرف تقریر و تحریر کا کمال دکھانے لگیں، وہ کبھی ترقی کے مقام پر نہیں پہنچ سکتی۔
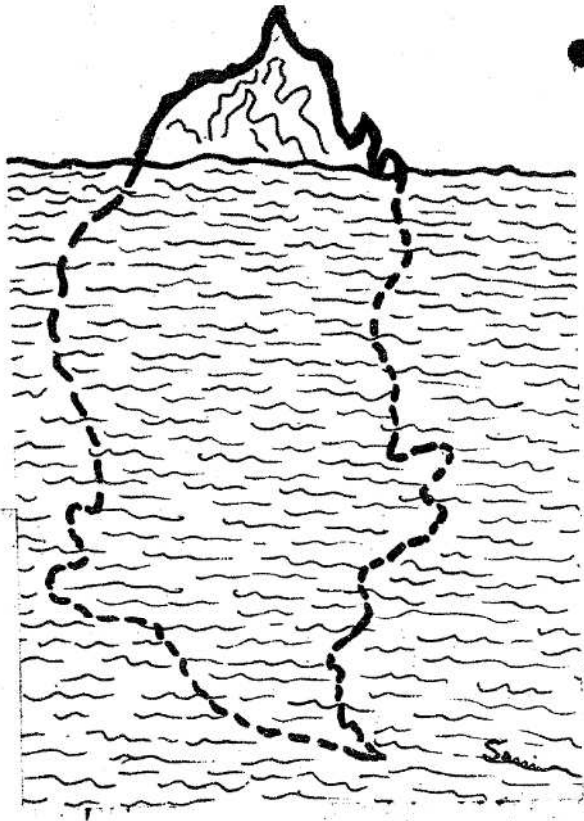
سعودی عرب

قطب جنوبی سے برف کے کوہ پیکر تودے لاکر اپنی پانی کی ضرورت پوری کرے گا

سعودی عرب اپنے تیل کے ذخیروں سے صنعتی دنیا کی کبھی نہ ختم ہونے والی تیل کی پیاس بجھاتا ہے۔ مگر دو طرف سمندروں سے گھرے ہوئے اس ملک کو میٹھے پانی کے لئے بیرونی دنیا کی ضرورت ہے۔ پانی کی کمی پوری کرنے کے لئے سعودی عرب اس سے پہلے سمندری پانی کو صاف کرنے کا کارخانہ لگا چکا ہے جو کھاری پانی کو صاف کرکے روزانہ ۱ ملین گیلن سے زیادہ میٹھا پانی تیار کرتا ہے۔ سا یہ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ برف کے پہاڑ (آئس برگ) جو قطب جنوبی کے سمندروں میں تیر رہے ہیں، ان کو کھینچ کر عرب کے ریگستان میں لایا جائے گا اور ان کو پگھلا کر تازہ پانی حاصل کیا جائے گا۔ یہ منصوبہ کثیر دولت کا متقاضی ہونے کے علاوہ کافی پیچیدہ ہے۔ اس کو روبعمل لانے کے لئے بیک وقت کئی علوم کی مہارتیں درکار ہیں۔ تاہم سمندر کے کھاری پانی کو میٹھا بنانے کے مقابلہ میں وہ سستا ہوگا۔

یہ منصوبہ سعودی شہزادہ محمد الفیصل اور فرانسیسی ماہر ڈاکٹر وکٹر (PAUL EMIL VICTOR) کے درمیان گفت وشنید کے بعد طے پایا ہے۔ اس منصوبہ کے تحت دس کروڑ ٹن کا ایک برف کا تودہ (آئس برگ) ۸۰۰۰ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے قطب جنوبی سے سعودی عرب کے ساحل پر لایا جائے گا۔ اس اندیشہ کے پیش نظر کہ راستہ میں سورج کی گرمی سے وہ پگھل نہ جائے، اس کو پلاسٹک سے ڈھک دیا جائے گا۔ اس برفانی پہاڑ کو کھینچنے کے لئے پانچ قسم کے جہاز استعمال ہوں گے جو نہایت مضبوط ڈوریوں سے تودہ سے بندھے ہوئے ہوں گے۔ برفانی تودہ قطب جنوبی سے چل کر بحر ہند میں داخل ہوگا۔ باب المندب پر اس کو توڑ کر ٹکڑے کیا جائے گا تاکہ اس تنگ گزرگاہ سے نکل کر وہ بحر احمر میں داخل ہو سکے۔ اس پورے سفر میں تقریباً چھ مہینے لگیں گے جب کہ راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور برفانی تودہ، حسب نقشہ، فی گھنٹہ ایک سمندری میل کی رفتار سے سفر کرتا رہے۔

اس منصوبہ پر عمل شروع کرنے سے پہلے کئی ابتدائی تیاریاں کرنی ہوں گی۔ سب سے پہلے خلائی سٹلائٹ کے

ذریعہ برفانی تودہ کی جائے قوع معلوم کی جائے گی۔ یہ
بھی اسی سے معل[illegible] گا کہ اس علاقہ کے سمندروں کی
لہریں کدھر سے کدھر جاتی ہیں۔ اس کے بعد ہوائی جہاز
ان کے اوپر اڑان کرکے اندازہ کریں گے کہ ان کی لمبائی،
چوڑائی اور اونچائی ٹھیک ٹھیک کتنی ہے اور ان کی صورت
کیا ہے۔ پھر جب ان کو خاص طرح کے تاروں سے باندھ
کر سمندری جہازوں سے کھینچا جائے گا تو اس سلسلے میں
توازن کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہوگا تاکہ برفانی تودہ
ٹوٹ نہ جائے۔ باب المندب پر اس کو کاٹنے کے لئے
تھرمل ڈرلنگ کا طریقہ استعمال کیا جائے گا۔ یہ ایسا ہی
ہوگا جیسے مکھن کی بڑی ٹکیہ کو باریک تار سے کاٹا جائے۔
ڈاکٹر وکٹر نے بتایا کہ اس منصوبہ پر وہ پچھلے پندرہ سال
سے مطالعہ و تحقیق کرتے رہے ہیں اور اب یہ منصوبہ آخری
مرحلہ پر پہنچ چکا ہے۔

ساحل عرب پر پہنچنے کے بعد برفانی تودے کے ٹکڑوں
کو مختلف مقامات پر منتقل کیا جائے گا۔ سعودی عرب جیسے
گرم ملک میں ان برفانی تودوں کو پگھلانے کے لئے کسی مشینی
عمل کی ضرورت نہیں۔ وہ سورج کی گرمی سے پگھلتا رہے گا۔
اندازہ ہے کہ ۱۲۰ گز چوڑے تودے کو سورج کی گرمی سے
پگھلنے میں ۱۶ سے ۱۸ ماہ تک لگیں گے۔ منصوبہ کامیاب رہا
تو ایک برفانی تودہ ایک سال سے زیادہ مدت کے لئے
کافی ہوگا۔

یہ منصوبہ صرف پینے کا پانی مہیا کرنے ہی کے لئے
کارآمد نہیں ہوگا بلکہ زراعت اور باغبانی اور صنعت میں
بھی اس سے کام لیا جا سکے گا۔ ریگستانی علاقوں یا خشک سالی
کے زمانوں کے لئے یہ منصوبہ ایک عظیم تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک شخص اپنے بچوں کے ساتھ باغ
میں داخل ہوا۔ وہاں کیڑے مکوڑے تھے۔
چوہے اور چیونٹیاں تھیں۔ پھر سب
کے بیچ میں ایک بھیانک بھیڑیا کھڑا
ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد
اس کے منہ سے کیا چیخ نکلے گی۔ وہ بے ساختہ
پکار اٹھے گا:
بچّو! بھیڑیا۔ بچاؤ اپنے کو بھیڑیئے سے۔
بھیڑیئے کے بھیانک چہرے کو دیکھنے کے
بعد وہ دوسری تمام چیزوں کو بھول
جائے گا۔ اس کو ایسا نظر آئے گا گویا
سارا باغ بھیڑیا بن گیا ہے۔ اس کے
سامنے اس کے سوا کوئی مسئلہ نہ ہوگا کہ
بھیڑیئے سے بچنے کی تدبیر کرے۔

ہم جس دنیا میں ہیں، اس میں بھی
بہت سے مسائل ہیں۔ ویسے ہی جیسے باغ
میں کیڑے اور چیونٹیاں۔ مگر انھیں
کے بیچ میں ایک سب سے بڑا مسئلہ کھڑا
ہوا ہے۔ یہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ اگر ہم
اس کو جان لیں تو ہم کو پوری کائنات میں
آخرت کے سوا کوئی دوسری چیز
دکھائی نہ دے۔ اس کے بعد ہم آخرت
کے لئے پکاریں گے، نہ کہ "کیڑوں اور
چیونٹیوں" کے لئے۔

جانا ہے بہت دور

ایک بزرگ نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔شروع شروع میں اس تعلیم گاہ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اساتذہ کو وقت پر تنخواہیں نہ ملتیں۔ طلباء کے لیے بعض اوقات کھانے کا انتظام ناممکن ہوجاتا۔ چھپر کے سایہ کے نیچے تعلیم دی جاتی اس طرح کی بے شمار دشواریوں کے درمیان اس درس گاہ کو سفر کرنا پڑا۔

مگر دشواریاں جس طرح آدمی سے کچھ چیزیں چھینتی ہیں، اسی طرح وہ اسے کچھ چیزیں دیتی بھی ہیں۔ ظاہری اسباب کی کمی عزم وہمت کو بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ ایسے جذبات اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں جو فراوانی کے اندر کبھی پیدا نہیں ہوتے۔

اس تعلیمی ادارے کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے ایک روز سارے ادارے میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ حالات بے حد نامساعد نظر آرہے تھے۔ درس گاہ کے ناظم نے طلبا و اساتذہ کا ایک اجتماع کیا جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا۔

"موجودہ حالات میں ممکن ہے آپ کا جی ملامت کرتا ہو کہ آپ کہاں آکر پھنس گئے۔ کسی بنی بنائی درس گاہ میں گئے ہوتے تو آرام سے رہ سکتے تھے۔ مگر یہ گھبرانے کی بات نہیں۔ کیونکہ دوسرے اگر حال کے وارث ہیں تو یہاں آپ ایک نئے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں لوگ تاریخ خواں ہوتے ہیں مگر آپ کو قدرت نے ایک ایسے مقام پر کھڑا کیا ہے کہ آپ تاریخ ساز بن سکتے ہیں۔"

یہ الفاظ جن حالات میں کہے گئے تھے اس کے اعتبار سے وہاں اس نے بجلی کا کام کیا۔ طلبہ اور اساتذہ میں ایک نیا جوش پیدا ہوگیا۔ وہ زندگی کی ایک اعلیٰ ترین اخلاقی قدر سے آشنا ہوئے۔ یہ کہ مستقبل کی تعمیر کے لیے حال میں جدوجہد کی جائے۔ یہ قدر، نفسیاتی طور پر، اس وقت ان کے لیے لامعلوم رہتی جب کہ وہ ایسے حالات میں نہ ہوتے۔ اسی طرح ناظم درس گاہ کی زبان سے بھی ہرگز یہ الفاظ نہ نکلتے اگر وہ آسودگی اور فارغ البالی میں ہوتے۔ ناظم اسی لیے یہ الفاظ بول سکے اور سننے والے اسی لیے ان کو سمجھ سکے کہ وہ دشوار حالات میں تھے۔ آسانیوں کی فضا میں انھیں یہ سبق نہیں مل سکتا تھا۔

جو لوگ اپنے آپ کو مشکل حالات میں پائیں وہ اسے اپنی بدقسمتی تصور کرتے ہیں حالانکہ یہ صرف سمجھنے کی غلطی ہے اگر صحیح ذہن ہو اور عزم بیدار ہو تو مشکل حالات اس سے زیادہ بڑی چیزیں دیتے ہیں۔ جو آسانیوں اور راحتوں میں کسی کو ملتی ہے۔ دشواریاں آپ کو اعلیٰ ترین انسانی قدروں سے آشنا کرتی ہیں۔ آپ کے اندر سوز و درد پیدا کرکے آپ کے کلام کو بے پناہ بنا دیتی ہیں۔ مشکلات کو عبور کرنے کا نیا ولولہ پیدا کرتی ہیں اور بالآخر آپ کو ان بلند ترین انسانوں میں شامل کرتی ہیں جن کو تاریخ خواں کے مقابلے میں تاریخ ساز کہا جاتا ہے۔

اوپر جس واقعہ کا حوالہ دیا گیا، وہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا واقعہ ہے اور جس نے مذکورہ تقریر کی، وہ مولانا مجیب اللہ ندوی تھے۔ اب خدا کے فضل سے یہ ادارہ "چھپر" کے دور سے نکل کر "بلڈنگ" کے دور میں داخل ہوچکا ہے اور تعلیم کے میدان میں ملت کو ایک نئی راہ دینے کے لئے کوشاں ہیں۔ ہر بار جب کوئی شخص نیا کام شروع کرتا ہے تو اس میں تذبذب کا مرحلہ لازماً آتا ہے، لیکن اگر وہ جما رہے تو استحکام کے مرحلہ پر پہنچنے سے بھی کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

یہ تھا مشرکین عرب کا کردار

ا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت (۶۱۰) ہوئی تو ایران کی ساسانی سلطنت اور روم کی بازنطینی سلطنت کے درمیان تصادم جاری تھا۔ اس دوطرفہ جنگ میں تقریباً بیس سال گزر گئے۔ ابتداءً ایرانیوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ ۶۱۵ تک رومی سلطنت کے تقریباً تمام شمالی مقبوضات اردن، شام، فلسطین، عراق، مصر، سب ایرانیوں کے قبضہ میں چلے گئے

یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب کہ مکہ میں اسلام اور غیر اسلام کے درمیان کش مکش جاری تھی۔ یہ کش مکش اتنی شدید ہو چکی تھی کہ ۶۱۵ میں مکہ کے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو اپنا وطن چھوڑ کر پڑوسی ملک حبش چلا جانا پڑا۔ ایسے حالات میں اہل کتاب رومیوں کے مقابلہ میں بت پرست ایرانیوں کی فتح مکہ والوں کے لئے گفتگو کا خصوصی موضوع بن گئی مشرکین نے مسلمانوں سے کہا کہ جس طرح پڑوس کے ملکوں میں بت پرست لوگ آسمانی کتاب کے حاملین پر غالب آئے ہیں، اسی طرح ہم بھی تمھارے اوپر غالب آجائیں گے۔ عین اس وقت قرآن کی سورہ نمبر ۳۰ اتری اور اعلان کیا گیا کہ چند سالوں کے بعد دوبارہ انقلاب آئے گا اور رومی سلطنت ایرانیوں کے اوپر غالب آجائے گی۔

سورہ روم کی یہ آیتیں مکہ والوں کے لئے مذاق کا نیا موضوع بن گئیں۔ ابی بن خلف نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تم کو یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا تو آؤ مجھ سے شرط کرلو۔ اس نے اپنی طرف سے یہ شرط رکھی کہ رومی اگر تین سال کے اندر غالب آگئے تو میں دس اونٹ تمھیں دوں گا۔ اور اگر اس کے خلاف ہوا تو تم دس اونٹ مجھے دینا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ قرآن میں بضع سنین کا لفظ ہے اور عربی میں بضع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے۔ اس لئے دس کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر ایک سو کر دو۔ حضرت ابوبکر نے دوبارہ ابی بن خلف سے یہ بات کہی۔ وہ راضی ہو گیا کہ دس سال کے اندر دونوں میں سے جس کی بات غلط ثابت ہوگی وہ دوسرے فریق کو سو اونٹ دے گا۔

قرآن کی پیشین گوئی لفظ بلفظ پوری ہوئی۔ نو سال بعد قیصر روم نے ۶۲۴ میں ایرانیوں کو نینوی (عراق) کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی اور اپنے تمام چھینے ہوئے علاقے ایرانیوں سے واپس لے لئے۔

اس مدت میں مکہ کی کش مکش اس نوبت کو پہنچ چکی تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تمام ساتھی مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ دونوں فریقوں کے درمیان کش مکش اس شدید نوبت کو پہنچی کہ ۶۲۴ میں جنگ بدر واقع ہوئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی، اور مشرکین مکہ کے اکثر بڑے بڑے سردار مارے گئے۔

اس سخت ترین ہیجانی فضا میں رومیوں کے غلبہ کی خبر آتی ہے۔ بدر کی شکست نے مکہ والوں کی دشمنی کو جنون کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے جب ابی بن خلف کے پاس پیغام بھیجا کہ ہماری بات پوری ہو گئی، اس لئے تم شرط کے مطابق مجھے ایک سو اونٹ

ادا کردو، تو مکہ میں کسی نے مخالفت نہ کی، اور ابی بن خلف نے کسی قسم کی تکرار کے بغیر پورے ایک سو اونٹ ابوبکر صدیق کے پاس بھیج دیئے۔ جب یہ اونٹ مدینہ پہنچے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو حکم دیا کہ ان کو صدقہ کر دو۔

سخت ترین دشمنی کے باوجود مشرکین عرب اس بات سے ناواقف تھے کہ شرط کے مطابق اپنے حریف کو ایک سو اونٹ نہ دینے کے فرضی بہانے تلاش کریں۔ یا ان کی تعداد میں کمی کرنے کی کوشش کریں۔ وہ ایک ہی بات جانتے تھے: جو بات طے ہو گئی ہے اس کو پورا کرنا ہے۔ خواہ وہ اپنے دوست کے ساتھ ہو یا دشمن کے ساتھ۔

۲۔ صلح حدیبیہ کے بعد ذی الحجہ ۶ھ میں آپ نے ارادہ فرمایا کہ امراء اور سلاطین کے نام دعوتی خطوط بھیجے جائیں۔ اس سلسلے میں تقریباً ایک ماہ ضروری تیاری میں صرف ہوا۔ اور محرم ۷ھ ہجری میں آپ نے ۸ بادشاہوں کے نام اپنے سفیروں کے ذریعہ خطوط روانہ کئے۔

انھیں میں سے ایک خط ہرقل قیصر روم کے نام تھا جس کی سلطنت اس وقت شام سے لے کر قسطنطنیہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے پاس دحیہ کلبی خط لے کر گئے۔ ہرقل کو اس زمانہ میں ایران کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوئی تھی اور اپنی نذر کے مطابق پیدل چل کر فلسطین آیا ہوا تھا۔ ہرقل کی خدمت میں آپ کا خط پیش کیا گیا تو اس نے حکم دیا کہ اس علاقہ میں عرب کا کوئی شخص آیا ہو تو اس کو میرے سامنے پیش کرو۔ اتفاق سے ابوسفیان (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور ابوجہل کے بعد مشرکین مکہ کے سب سے بڑے لیڈر تھے) اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ بغرض تجارت شام آئے ہوئے تھے۔ ان کو ڈھونڈ کر لایا گیا۔ قیصر نے کہا، تمہارے یہاں جس آدمی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، میں اس کی بابت تم سے سوال کروں گا تم اپنے علم کے مطابق اس کا جواب دو۔

اس موقع پر ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان کے نزدیک ان کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ وہ آپ کو مکمل طور پر ختم کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ مگر ساری گفتگو میں ابوسفیان نے ایک بھی غلط بات نہیں کی: چند سوال و جواب یہ تھے:

ہرقل: محمد کا نسب کیسا ہے

ابوسفیان: شریف وعظیم

ہرقل: کیا اس شخص پر کبھی جھوٹ بولنے کی تہمت لگائی گئی۔

ابوسفیان: کبھی نہیں۔

ہرقل: ان کے ماننے والوں کی تعداد گھٹ رہی ہے یا بڑھ رہی ہے۔

ابوسفیان: بڑھ رہی ہے۔

ہرقل: وہ کس بات کی تعلیم دیتے ہیں۔

ابوسفیان: وہ توحید اور حسن اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں

ہرقل: کیا وہ عہد کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں

ابوسفیان: نہیں

ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں نے کسی سوال کے جواب میں غلط بیانی نہیں کی اور نہ طعن کیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میرے

ساتھی مجھے جھوٹا کہیں گے۔ صرف آخری سوال کے جواب میں وہ اتنا اضافہ کر سکے" امسال ہمارے ان کے درمیان ایک معاہدہ (حدیبیہ) ہوا ہے، دیکھئے اس میں وہ کیا کرتے ہیں "۔

اس سوال وجواب کے وقت ابوسفیان اور ان کے ساتھی مشرک تھے اور سب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت ترین دشمنی تھی۔ مگر ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ آپ کے بارہ میں کوئی غلط بیان دیں یا آپ کو مطعون کرنے کی کوشش کریں۔

۴۔ نبوت کے دسویں سال آپ کے چچا ابوطالب کا انتقال ہوگیا۔ اب خاندانی رسم کے مطابق عبدالعزیٰ (ابولہب) بنی ہاشم کا سردار منتخب ہوا جو اس وقت خاندان کا سب سے بزرگ آدمی تھا۔ ابولہب آپ کے خاندان میں آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ شعب ابی طالب کے مقاطعہ کے زمانہ میں سارے خاندان بنی ہاشم نے آپ کا ساتھ دیا تھا۔ صرف ایک ابولہب تھا جو آپ سے الگ رہا۔ اب جب کہ ابولہب کو خاندان کے سردار کا مقام بھی مل گیا، اس نے آپ کو خاندان سے خارج کر دیا۔ خاندان سے خارج کیا جانا قدیم عرب میں بدترین سزا تھی۔ اس کے بعد آدمی بالکل تنہا ہو جاتا تھا۔ جب کہ قبائلی نظام میں خاندانی پناہ کے سوا کوئی پناہ نہ تھی جس کے تحت آدمی محفوظ طور پر اپنی زندگی گزار سکے۔ چنانچہ اس کے بعد مکہ میں لوگوں کی مخالفتیں بہت بڑھ گئیں۔ اس سے پہلے زیادہ تر زبانی طنز وتشنیع کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اب جارحانہ قسم کی سختیاں شروع ہوگئیں۔ یہ حالات دیکھ کر آپ نے ارادہ کیا کہ عرب کے دوسرے بڑے شہر طائف جائیں اور وہاں کے لوگوں سے پناہ کی درخواست کریں۔

آپ مکہ سے پیدل چل کر طائف پہنچے جو مکہ کے جنوب مشرق میں ۶۵ میل پر واقع تھا۔ امید کے خلاف وہاں کے لوگوں نے بہت برا برتاؤ کیا۔ نہ صرف یہ کہ آپ کو پناہ دینے پر تیار نہ ہوئے بلکہ آپ کو پتھر مار مار کر بستی سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ حتیٰ کہ آپ کو وہاں کے لوگوں سے کہنا پڑا کہ دیکھو یہ خبریں مکہ نہ پہنچنے پائیں۔ ایک طرف اپنے وطن مکہ میں زمین کا تنگ ہو جانا، دوسرے طائف والوں کا وحشیانہ سلوک، ان واقعات نے آپ پر شدت سے اثر کیا۔ طائف سے واپسی پر آپ نے اپنے رب سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

اللھم الیک اشکو ضعف قوتی وقلۃ حیلتی و

عرب کے مشرکین نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی شدید مخالفت کی لڑائیاں لڑیں۔ آپ کو اپنے وطن سے نکالا۔ مگر انھوں نے کبھی آپ کے خلاف کوئی ذلیل حرکت نہیں کی۔ آپ کو اپنے مخالفین کی طرف سے ذلیل اور رکیک حرکتوں کا تجربہ صرف ہجرت کے بعد ہوا جب کہ آپ کا سابقہ یہود کے ساتھ پیش آیا جو کتابِ الٰہی کے حامل تھے، جو اپنے کو نبیوں کا وارث کہتے تھے، جو گویا اس وقت کے "مسلمان" تھے!

وهو اني على الناس يا ارحم الراحمين

خدایا میں تجھی سے اپنی قوت کی کمی اور اپنی بے سروسامانی اور لوگوں کی نظر میں حقیر ہونے کی شکایت کرتا ہوں۔

طائف سے واپسی کے بعد کوئی دوسری جگہ نہ تھی جہاں آپ جائیں۔ کیونکہ مکّہ سے نکالے ہوئے ایک شخص کو پناہ دینے کا کام طائف جیسے بڑے شہر کا کوئی سردار ہی کر سکتا تھا۔ مجبوراً آپ نے دوبارہ مکہ کا رخ کیا اور شہر کے باہر غار حرا میں اپنے خادم زید بن حارثہ کے ساتھ مقیم ہوئے۔

اب سوال یہ تھا کہ کیا کریں۔ چند روز کے غور وفکر کے بعد آپ نے مکہ کے ایک سردار مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ میں غار حرا میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ تم مجھ کو اپنی پناہ میں لے لو تاکہ مکہ میں آ کر رہ سکوں۔ مطعم ایک کافر تھا اور بدر سے پہلے کفر ہی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اس کے قومی دشمن کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر جب آپ نے اس سے حفاظت طلب کی تو اس کے لئے ناممکن ہوگیا کہ وہ آپ کو اپنی حفاظت میں لینے سے انکار کر دے۔ اس کے چھ جوان لڑکے تھے۔ اس نے تمام لڑکوں کو حکم دیا کہ تم تلوار لے کر جاؤ اور محمد کو اپنی حفاظت میں مکہ لے آؤ۔ چنانچہ اس کے یہ لڑکے غار حرا پہنچے اور ان کی تلواروں کے سایہ میں آپ دوبارہ مکہ میں داخل ہوئے مکہ میں آکر آپ نے سب سے پہلے کعبہ کا طواف کیا، جب آپ طواف میں مشغول تھے تو مطعم بن عدی نے دروازہ پر کھڑے ہو کر اعلان کیا:

"میں نے محمدؐ کو پناہ دی ہے، خبردار کوئی انھیں تکلیف نہ پہنچائے"

مطعم بن عدی ایک کافر و مشرک تھا۔ نیز آپ کے دشمن گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر جب آپ نے اس سے پناہ طلب کی تو اس کے لئے ناممکن ہوگیا کہ آپ کو پناہ دینے سے انکار کردے۔

یہ تھا کردار ان لوگوں کا جو مشرک و کافر کہے جاتے ہیں۔

طبقات ابن سعد (جلد ۱، صفحہ ۱۶۳) میں زہری سے منقول ہے کہ ایک یہودی نے کہا کہ تورات میں پیغمبر آخر الزماں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں، وہ سب میں نے آپ کے اندر دیکھ لئے تھے۔ صرف ایک وصف باقی تھا۔ اور وہ تھا حلم و بردباری۔ چنانچہ اس کے تجربہ کے لئے میں نے آپ کو ۳۰ دینار قرض دیئے۔ اس کے بعد میں خاموش رہا۔ یہاں تک کہ جب مدت پوری ہونے میں صرف ایک دن باقی تھا میں آپ کے یہاں پہنچا اور سختی سے تقاضا کیا میں نے کہا میرا حق ادا کیجئے، اور میں جانتا ہوں کہ عبد المطلب کا خاندان تو ہمیشہ کا ٹال مٹول کرنے والا ہے۔

اس وقت عمر فاروقؓ آپ کے ساتھ تھے۔ یہودی کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی غضب ناک ہوگئے اور کہا: اگر رسول اللہ کا خیال نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: غفر الله لك يا ابا حفص، نحن كنا الى غير هذا امنك احوج، تامرني بحسن القضاء وتامره بحسن الطلب

اے ابو حفص، خدا تمھیں معاف کرے۔ ہم تم سے ایک اور سلوک کے زیادہ محتاج تھے۔ تم مجھ سے بہتر ادائگی کے لئے کہتے اور اس کو نصیحت کرتے کہ بہتر طریقے سے طلب کرو۔ ٠٠٠

جنگلات کی اہمیت

اگر ہمالیہ کے تمام جنگلات تباہ کر دیے جائیں تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا ؟ ہمالیہ سے نکلنے والے دریا جیسے گنگا اور جمنا دہلی اور ان تمام علاقوں کو زیرآب کریں گے جن میں یہ دریا گزرتے ہیں اور ہمالیائی ڈھلانوں میں بہتے ہوئے ان دھاروں سے جو ملبہ بہہ کر اکٹھا ہوگا اس سے دریاؤں کی سطح میں متواتر اضافہ ہوتا رہے گا اس طرح جنگلات ان دریاؤں میں ایسا نظم و ضبط قائم رکھتے ہیں جس سے پہاڑ اپنی صحیح پوزیشن میں قائم رہتے ہیں، دریاؤں کے آس پاس سبزہ و نباتات کو تباہ کرنے سے ہمارے بہت سے اہم باندھوں میں کٹاؤ کی رفتار تیز ہوتی ہے۔

سیلابوں سے ہماری فصلوں کو ہر سال ایک ارب روپے کا نقصان پہنچتا ہے اس کے علاوہ زمین کے کٹاؤ سے جو بالواسطہ نقصان ہوتا ہے وہ بھی بھاری نقصان ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس سے زمین کی زرخیزی کو تقریباً ۷ ارب روپے کی مالیت کا نقصان پہنچتا ہے۔ اس سے ہر سال ۶۰ ارب ٹن وزنی مٹی ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے۔

راجستھان میں جو کچھ بچی کھچی ہریالی رہ گئی ہے اگر اسے ختم کر دیا جائے تو دہلی پر اس کا تباہ کن اثر ہوگا۔ دہلی والے اگر ریت کے تلے نہ دبیں تو ریت سے آلودہ ہو جائیں گے بابل اور میسوپوٹمیا میں ایسا ہو چکا ہے۔

زراعت اور جنگلات ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ جنگلات زمین کی زرخیزی، آب پاشی اور سب سے بڑھ کر ایک قدرتی توازن کے ذریعہ اس کی زرعی پیداوار کو برقرار رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ جنگلات زراعت کو کیڑے مکوڑوں اور پودوں کی بیماریوں سے بچاتے ہیں۔ لگ بھگ ۳ کروڑ ۹۰ لاکھ قبائل کے لیے جنگلات گھر اور مسکن ہیں۔

ماحول کی آلودگی اور کثافت جو شہری علاقوں میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہے، جنگلات میں درختوں کی موجودگی سے کم ہو جاتی ہے۔ دہلی کے تمام درخت اکھاڑ پھینکے جائیں تو موسم گرما میں دہلی کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک گرم بھٹی سے کم نہ ہوگی۔

ملک کی ترقی کے لیے جنگلات کی مسلمہ اہمیت ہونے کے باوجود جنگلات پر برائے نام ہی سرمایہ کاری کی گئی ہے جس کا تناسب صرف ۰٫۶ فی صد ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ محکمہ جنگلات سے صرف ۱ر۶ فی صد آمدنی ہوتی ہے۔ کاغذی طور پر ہندوستان کا ۷½ کروڑ ہیکٹر زمینی رقبہ جنگلات پر مشتمل ہے جو مکمل زمینی رقبہ کا ۲۳ فی صد حصہ ہے لیکن منافع بخش جنگلاتی رقبہ اس سے آدھا ہے۔ جاپان میں جنگلات کے فی کس رقبہ کی شرح 0.27 ہیکٹر فی کس۔ آسٹریلیا میں ۷.۹ ہیکٹر فی کس اور مجموعی طور پر پوری دنیا میں 1.07 ہیکٹر فی کس ہے جب کہ ہندوستان میں اس کا تناسب صرف 0.13 ہیکٹر فی کس ہے جنگلات کی موجودہ غیر اطمینان بخش آمدنی سے یہ صورت حال اور بھی ابتر ہو جاتی ہے۔

ماہرین کا اندازہ ہے کہ جنگلات کی پیداوار موجودہ پیداوار کے مقابلہ میں دس گنا بڑھائی جا سکتی ہے۔ جنگل قدرت کی ایک عظیم نعمت ہے مگر ہم نے ابھی اس سے بہت کم فائدہ حاصل کیا ہے۔

اور اس نے مستقبل کے لئے جدوجہد شروع کر دی

رات کا وقت تھا بارش پورے عروج پر تھی ہوا کے تیز و تند جھکڑ چل رہے تھے، سردی سے جسم اکڑا جا رہا تھا۔ جھونپڑے کی ٹپکتی ہوئی چھت پر سے پانی کی بوندیں اس پر پھول کی مانند برس رہی تھیں۔ لیکن وہ ہر چیز سے بے خبر زمین پر پڑا اپنے ماضی کی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ پچھلے تمام نقوش اس کی آنکھ کے سامنے گزرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا جسے نمونیا جیسے ہولناک مرض نے اپنے دامن میں سلا لیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا جسنے اسی جھونپڑے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیا تھا وہ اپنی بہن کو دیکھ رہا تھا جو اسی جھونپڑے میں سردی سے اکڑ کر مر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا مگر ان آنسوؤں کی کوئی قیمت نہ تھی۔

اچانک اس کے ذہن نے کروٹ لی اور وہ ماضی کو بھول کر مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا "کیا اس کا بھی یہی حشر ہوگا جو اس کے بدقسمت ماں باپ کا ہوا ہے۔؟ کیا یہ ظالم موت اسے بھی اپنی آغوش میں سلا لے گی؟ نہیں نہیں، میں موت سے پنجہ کشی کروں گا اور اس سے اپنے ماں باپ اور بہن کا انتقام لوں گا۔"

اس کے ذہن نے پھر ایک غوطہ لگایا اور تعلیم کے سمندر میں جا پہنچا اب اس نے اپنے آپ سے سوال کیا "جعفر تم کب تک جاہل رہ کر زندگی کے بقیہ دن کاٹو گے اس سے بہتر ہے کہ تم اسکول میں داخل ہو جاؤ" لیکن میں تو غریب لڑکا ہوں میں کیسے اسکول میں داخل ہو سکتا ہوں"؟ اس کے دل نے سرگوشی کی۔ اس کے ذہن نے فوراً جواب دیا "تم اپنے رکھے ہوئے پیسوں سے خوانچہ کیوں نہیں لگا لیتے۔ تاکہ نفع کما کر تم اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکو اور آئندہ ڈاکٹر بن کر خلق کی خدمت کرو تاکہ کوئی بھی تمہارے ماں باپ اور بہن کی طرح اس ظالم موت کا شکار نہ ہونے پائے"

اب اس نے مستقبل کی جدوجہد شروع کر دی ایک ایسی جدوجہد جو ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ نو، دس، گیارہ، بارہ، تیرہ، چودہ، پندرہ ـــــ پورے پندرہ برس میں مکمل ہونے والی تھی۔ یہ ایک پندرہ سالہ منصوبہ تھا۔ پندرہ سالوں کے بعد وہ دن آنے والا تھا جب وہ باقاعدہ ڈاکٹر بن کر مخلوق کی خدمت کرے اور دنیا سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کر سکے۔

وہ شام سے رات گئے تک خوانچہ فروشی کرتا اور دن کو اسکول میں پڑھتا۔ اس طرح اس نے میٹرک کیا۔ وہ میٹرک میں فرسٹ آیا۔ سارے اسکول میں اس کی فرسٹ پوزیشن تھی۔ اب اس کو اسکالرشپ ملنے لگا۔ اس نے خوانچہ فروشی چھوڑ دی اور اپنے وقت کو اور زیادہ تعلیم میں صرف کرنے لگا وہ اپنی محنت کی بدولت ہر سال اوّل آتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے ڈاکٹری کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا۔

اب وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ شہر کا سب سے زیادہ کامیاب ڈاکٹر۔ "مجھے ڈاکٹر کس چیز نے بنایا" کبھی کبھی وہ اپنے دل میں سوچتا۔ "صرف ایک چیز نے ـــ میرے مشکل حالات نے مجھے ڈاکٹر بنایا ہے۔ مجھ پر حالات کا جو سخت دباؤ پڑا اگر وہ نہ ہوتا تو شاید میرے اندر وہ زبردست محرک اور قوت عمل پیدا نہ ہوتی جسنے مجھ کو اتنی محنت اور لگن پر اکسایا اور بالآخر ڈاکٹر بنا کر چھوڑا" اسنے اپنے دروازہ پر تختی لگا دی جسپر لکھا ہوا تھا۔ مشکلات سے نہ گھبرائیے ـ مشکلات آپکے لئے ترقی کا زینہ ہیں۔

لقاء مع مسیحی دخل الاسلام

طرابلس (لیبیا) کی مسلم۔مسیحی کانفرنس (فروری ۱۹۷۶) میں جو لوگ شریک ہوئے، ان میں ایک یوسف مظفر الدین بھی تھے۔ یہ شمالی امریکہ کے باشندے ہیں۔ وہ ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئے، اور ۱۹۶۲ میں اسلام قبول کرلیا۔

انھوں نے ایک ملاقات میں بتایا کہ میرے جیسے تقریباً ایک ملین امریکی ہیں جو عیسائیت سے نکل کر اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ آج امریکہ کو، اپنی ساری ترقیوں کے باوجود بے شمار قسم کے سماجی اور خاندانی مسائل درپیش ہیں۔ ہر امریکی ان کے بارے میں سوچتا ہے۔ مگر اپنے آبائی مذہب میں اس کو ان مسائل کا حل نظر نہیں آتا۔ اس لئے وہ یا تو غیر مطمئن رہتا ہے یا عیسائیت کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کرلیتا ہے

انھوں نے بتایا کہ امریکی معاشرہ اور مسیحی چرچ دن بدن ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ امریکی معاشرہ کی بے اطمینانی اور مسیحی چرچ کا اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر رہنا ہے۔ ان حالات نے امریکی باشندوں میں دین فطرت کی تبلیغ واشاعت کے کام کے لئے وسیع میدان کھول دیا ہے۔ مگر سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس اسلامی لٹریچر نہیں۔ آج کا انسان جس اسلوب اور جس نہج پر کسی چیز کے مطالعہ کا عادی ہے، اس زبان اور اسلوب میں اسلام پر کتابیں نہیں ملتیں۔

شمالی امریکہ میں ۱۹۷۱ میں ایک اسلامی تنظیم قائم ہوئی ہے اس کا خاص مقصد امریکہ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت ہے۔ یوسف مظفر الدین اس تنظیم کے صدر ہیں۔ اس تنظیم کو اپنے کام کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے طرح طرح کی مشکلات پیش آرہی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے بیان کے مطابق، بہت سے نومسلم امریکی مختلف الزامات کے تحت جیلوں میں بند کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح نہ صرف ان کو قبول اسلام کی سزا دی جارہی ہے بلکہ ان کو اس امر سے بھی روک دیا گیا ہے کہ وہ ملک میں اپنی دعوتی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ انھوں نے کہا ہماری کوشش یہ ہے کہ امریکہ میں اسلامی دعوت کی تحریک اتنی طاقتور ہو جائے کہ وہ اس قسم کی مشکلوں سے نمٹ سکے۔ پھر بھی اگر ہم ناکام رہے تو ہم دوسرے اسلامی ملکوں سے رابطہ قائم کریں گے اور اس سلسلہ میں ان سے مدد حاصل کریں گے۔ وہ امریکہ سے ایک اسلامی اور دعوتی ماہنامہ بھی شائع کر رہے ہیں۔

یہ عذر صحیح نہیں

"مسلمان خود ہی اسلام کو چھوڑے ہوئے ہیں پھر وہ کس منہ سے دوسروں کو اسلام کا پیغام دے سکتے ہیں"۔ اس اعتراض کا دین وشریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ہے آپ نے عرب میں کام شروع کیا تو ایک طرف آپ تھے، دوسری طرف شرک وکفر میں مبتلا لوگ۔ مگر دوسرے انبیاء "بگڑے ہوئے مسلمانوں" کے درمیان مبعوث ہوئے۔ اس معاملہ میں انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ ہمارے لئے اسی طرح اسوہ ہے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اسوہ ہے کیونکہ قرآن میں صراحتہً حکم دیا گیا ہے: فبھداھم اقتدہ (ان کے طریقہ کی پیروی کرو)

یہاں ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال پیش کریں گے۔ وہ مصر میں بنی اسرائیل کے درمیان مبعوث ہوئے تھے۔ امت محمدی کے وجود میں آنے سے پہلے بنی اسرائیل اسی طرح "مسلمان" تھے جس طرح اب اصطلاحاً آپ ؐ کی امت کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ بنی اسرائیل اس زمانہ میں اس مقام دعوت پر تھے جس پر آپ ؐ کی بعثت کے بعد امت مسلمہ کو فائز کیا گیا ہے۔ جس خصوصیت کے لئے امت مسلمہ کو "خیر امت" کہا گیا ہے اسی خصوصیت کے لئے ان کے حق میں فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْن (بقرہ-۴۷) کے الفاظ آتے ہیں۔ یہ ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ کی بعثت کے وقت بنی اسرائیل میں وہ ساری کمیاں پوری طرح موجود تھیں جو آج مسلمانوں میں نظر آتی ہیں، مگر اس کے باوجود غیر مسلموں پر تبلیغ حق کے کام کو موخر نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالےٰ نے ایک طرف یہ حکم دیا کہ بنی اسرائیل کی دینی و اخلاقی اصلاح کی مہم چلائی جائے۔ (یونس-۸۷) دوسری طرف اسی کے ساتھ انھیں یہ حکم بھی دیا گیا کہ وہ مصر کی قبطی قوم کو خدا کا پیغام پہنچائیں:

اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی

فرعون کے پاس جا کیونکہ وہ سرکش ہو گیا ہے

یہ نہیں کہا گیا کہ تم چونکہ خود اسلام سے دور ہو اس لئے فی الحال صرف دینی اصلاح میں مشغول رہو بلکہ اپنی داخلی اصلاح کے ساتھ بیک وقت غیر مسلم قوم کو خطاب کرنے پر بھی انھیں مامور کیا گیا۔

"پہلے مسلمانوں کو تیار کرو" کے ذہن کے تحت ہمارے یہاں بے شمار کام ہو رہے ہیں، حتیٰ کہ بعض ایسے

یسعیاہ نبی کی زبان سے بائبل میں کہا گیا ہے:

"خداوند فرماتا ہے کہ تم میرے گواہ ہو اور میرے خادم بھی جسے میں نے برگزیدہ کیا تاکہ تم جانو اور مجھ پر ایمان لاؤ۔ میرے سوا کوئی بچانے والا نہیں۔ سو تم میرے گواہ ہو" یسعیاہ ۴۳: ۱۲-۱۰

گویا اہل ایمان کی بیک وقت دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود خدا کے خادم اور فرماں بردار بنیں۔ دوسرے یہ کہ وہ قوموں کے اوپر خدا کے دین کے گواہ ہوں تاکہ، بائبل کے الفاظ میں، جب تمام قومیں فراہم کی جائیں اور سب امتیں جمع ہوں تو یہ لوگ خدا کی طرف سے سب کے اوپر گواہ بن کر کھڑے ہو سکیں۔

کام بھی ہیں جس کے بانی اول کا انتقال ۱۸۹۸ میں ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹا نہیں بلکہ ایک دن کے ناغہ کے بغیر مسلسل آج تک جاری ہے۔ اس طرح گویا مسلمانوں کو تیار کرنے کی صرف ایک جماعت وہ ہے جس کی سرگرمیوں پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے۔ مگر آج جب کہ اس کے حامیوں کے دعوے کے مطابق یہ تحریک بین اقوامی بن چکی ہے منقسم ہندستان کا کوئی ایک گاؤں یا محلہ بھی ایسا وجود میں نہ آسکا جس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہو کہ وہ، مذکورہ معیار کے مطابق' اس قابل ہو گیا ہے کہ دوسروں کو اسلام کی دعوت دے سکے۔

ہمارے اس ملک میں روزانہ ایک لاکھ سے زیادہ آدمی مرجاتے ہیں۔ ساری دنیا کے اعتبار سے دیکھا جائے تو روزانہ مرنے والوں کی تعداد تقریباً دس لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہر روز دس لاکھ آدمی دین حق سے بے خبری کی حالت میں مر رہے ہوں اور ہم پوری پوری صدی صرف اس عذر میں گزار دیں کہ ابھی ہم مسلمانوں کو تیار کر رہے ہیں۔ اور یہ جواب اس نبی کے امتیوں کا ہو جس کا کہنا یہ تھا کہ لوگ پتنگوں کی طرح آگ میں گر رہے ہیں اور میں ان کو اپنی ساری طاقت سے کھینچ کر نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

کسی کے مخارج غلط ہوں یا سورتیں یاد نہ ہوں تو ہر شخص جانتا ہے کہ نماز اس سے ساقط نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اگر اس کو کوئی غلط عادت لگی ہوئی ہو تب بھی کوئی مفتی یہ فتویٰ نہیں دے گا کہ تمھاری عادت صحیح ہو جائے، اس وقت نماز پڑھنا۔ مگر شرعی ذمہ داریوں کا یہی اصول ہم اس وقت بھول جاتے ہیں جب کہ معاملہ دوسری قوموں کے سامنے دعوتی فریضہ ادا کرنے کا ہو۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ نماز کی اہمیت ہم کو معلوم ہے۔ مگر شہادت حق اور دعوت الی اللہ کی اہمیت کی ابھی تک ہم کو خبر نہیں۔ "اولیں پرشش نماز بود" کا سبق ہم کو یاد ہے۔ مگر اس حقیقت کو ہم بھول گئے ہیں کہ خدا کے بے خبر بندوں کو خدا کے دین سے باخبر کرنا امت محمدی پر اسی طرح فرض ہے جس طرح ایک شخص کے لئے روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھنا۔

الفاظ جو فضا میں گم ہو گئے

مولانا محمد علی نومبر ۱۹۳۰ میں لندن کی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ یہاں انھوں نے جو طوفان خیز تقریر کی، اس کے چند الفاظ یہ تھے:

"آج میں جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو ایسی حالت میں واپس جاؤں جب کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر آپ مجھے ہندستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی ...

ہمارے پاس ۳۲ کروڑ آدمی ہیں۔ جب وہ قحط اور پلیگ سے لاکھوں کی تعداد میں مرنا جانتے ہیں تو یقیناً وہ برطانوی گولی سے بھی جان دے سکتے ہیں"۔ آج ان الفاظ کو تلاش کیا جائے تو وہ تاریخ کی الماری کے سوا اور کہیں نہیں ملیں گے۔

محمود پاشا بارودی (۱۳۲۲-۱۲۵۵ھ)

قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دنقلہ وبربر کے ناظم تھے۔ وہ عربی، ترکی، فارسی اور انگریزی زبانیں جانتے تھے۔ انھیں دو چیزوں کا ذوق تھا۔ سیاست اور شاعری۔ ان کا اپنا دیوان دو جلدوں میں مصر سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب "مختارات البارودی" ہے۔ اس کتاب کے چار حصے ہیں اور اس میں عہد عباسی کے ۳۰ شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے۔

مصر میں وہ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ میجر جنرل کی حیثیت سے انھیں فرانس اور انگلستان کے سفر کا بھی موقع ملا۔ مصر میں جب انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو اس میں ان کا نام بھی تھا۔ لوگوں میں عام چرچا یہ تھا کہ بارودی اس انقلابی تحریک کے قائد ہیں۔ تاہم یہ بغاوت وادیٔ نیل پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد ختم ہوگئی۔ مگر حکومت نے باغیوں کی پکڑ دھکڑ شروع کی تو بارودی بھی اس میں گرفتار ہوئے۔ ان کو جلاوطن کرکے جزیرہ سراندیپ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ سترہ سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک قید رہے۔ خدیو عباس ثانی کی سفارش پر ۱۳۱۷ھ میں ان کو معافی دی گئی۔ وہ مصر واپس آگئے۔ اس کے بعد وہ صرف پانچ سال تک زندہ رہ سکے۔ آخر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ بارودی کو عربی شاعری میں امرؤ القیس اور بشار کا درجہ حاصل تھا۔ انھوں نے موجودہ دور میں عربی شاعری کے احیاء کا کام کیا۔

ان کے ناموافق حالات نے ان کے لئے ایک نیا موافق امکان پیدا کر دیا

مادہ جب "برباد" کیا جاتا ہے تو وہ انرجی بن جاتا ہے جو مادہ کی زیادہ وسیع اور طاقت ور صورت ہے۔ یہی خدا کی اس کائنات کا عام قانون ہے۔ یہاں ہر محرومی کے اندر ہمیشہ ایک نئی یافت کا امکان چھپا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ صفتِ خاص جس کا ظہور عالم مادی میں ہوا ہے، اس کا وعدہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اہل ایمان کے لئے کیا گیا ہے۔ ان کے لئے ان کا رب ناموافق حالات میں بھی موافق پہلو پیدا کر دیتا ہے، بشرطیکہ وہ فی الواقع خدا کے ہو چکے ہوں۔ ان کی منصوبہ بندی خالص خدائی مشن کے لئے ہو نہ کہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے۔

مکہ میں جب مسلمانوں کے حالات سخت ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا: "تم لوگ حبش چلے جاؤ۔ وہاں کا بادشاہ نجاشی عیسائی ہے اور نیک نفس ہے۔ وہ تم لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔" چنانچہ ۶۱۵ء میں پندرہ آدمی جدہ پہنچے اور کشتیوں پر سوار ہو کر حبش چلے گئے۔ دوسری بار ۶۱۷ء میں ایک سو مسلمان حبش گئے۔

بظاہر یہ ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا۔ مگر اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک خیر کی صورت پیدا کر دی۔ مکی مسلمانوں کا حبش پہنچنا وہاں اسلام کو موضوع بحث بنانے کا سبب بن گیا۔ پیغمبر اسلام کی بعثت اور آپ کی دعوت کی خبریں حبش میں پھیلنے لگیں۔ قریش کا ایک مخالفانہ وفد حبش پہنچنے کے نتیجہ میں حضرت جعفر کو موقع ملا کہ دربار شاہی میں اسلام کی دعوت پر مفصل تقریر کر سکیں۔ اس طرح کے واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ حبش سے ۲۰ عیسائیوں کا ایک وفد مکہ آیا تاکہ اصل معاملہ کی تحقیق کر سکے۔

جب یہ لوگ مکہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں تھے۔ وہ وہاں گئے اور آپ سے مل کر مختلف سوالات کئے اور پوچھا کہ آپ کیا تعلیم لائے ہیں۔ آپ نے بتایا کہ خدا نے میرے اوپر اپنا کلام اتارا ہے اور قرآن کی کچھ آیات پڑھ کر سنائیں۔ یہ لوگ چونکہ تعصب سے خالی تھے، قرآن سن کر بہت متاثر ہوئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انھوں نے تصدیق کی کہ بلاشبہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔

جس وقت یہ واقعہ ہو رہا تھا، قریش کے بہت سے لوگ وہاں جمع تھے اور سارا ماجرا دیکھ رہے تھے۔ انھیں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی آرہا تھا کہ جس دین کو انھوں نے رد کر دیا ہے، اس کو باہر کے لوگ آآکر اپنا رہے ہیں۔ حبش کے یہ لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھے تو ابو جہل اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر ان سے راستہ میں ملا۔ اس نے ان لوگوں کو ملامت کرتے ہوئے کہا: "ہمارا خیال ہے کہ تم سے زیادہ احمق قافلہ یہاں کبھی نہیں آیا۔ تمھارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لئے یہاں بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کرو اور واپس جا کر اپنے ساتھیوں کو بتاؤ۔ مگر ابھی تم اس سے ملے ہی تھے کہ اپنے دین کو چھوڑ بیٹھے۔"

جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے یہ بنی اسرائیل کے علماء تھے (شعراء ۔ ۱۹۷) انھوں نے ابو جہل وغیرہ سے کوئی بحث نہیں کی۔ بلکہ صرف یہ جواب دیا: "سلام ہے بھائیو تم کو، ہم تمھارے ساتھ جہالت نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے" (ابن ہشام)

انھیں لوگوں کے بارے میں قرآن میں آیا ہے:

"جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، یہ بلاشبہ خدا کی طرف سے ہے۔ ہم تو پہلے ہی سے اس کو ماننے والے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو دہرا اجر دیا جائے گا، ان کے صبر کے بدلے۔ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انھیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ انھوں نے جب لغویات سنی تو یہ کہہ کر اس سے الگ ہو گئے: ہمارے اعمال ہمارے ساتھ اور تمھارے اعمال تمھارے ساتھ، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔"

قصص ۵۵-۵۲

الرسالہ کے شائقین سے گزارش ہے کہ وہ پرچہ بذریعہ وی پی طلب نہ فرمائیں، بلکہ اپنا زرتعاون منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دیں۔ یہ طرفین کے لئے سہولت کا باعث ہے۔

جو لوگ سالانہ یا ششماہی زرتعاون بیک وقت ادا نہ کرسکیں، وہ ہر مہینے دو روپے کا ٹکٹ لفافہ میں رکھ کر بھیج دیں۔ پرچہ انھیں روانہ کر دیا جائے گا۔

خریدار حضرات براہ کرم اپنے خطوط میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر فرمائیں۔

خط و کتابت کے وقت یا زرتعاون بھیجتے ہوئے اپنا پتہ صاف اور حتی الامکان انگریزی میں تحریر فرمائیں

پتہ پر کسی شخص کا نام نہ لکھیں۔ بلکہ ایڈیٹر الرسالہ یا منیجر الرسالہ تحریر فرمائیں

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ ضرور تحریر فرمائیں

الرسالہ نہ صرف ملک کے مختلف حصوں میں پڑھا جاتا ہے بلکہ ملک کے باہر بھی عرب دنیا اور دوسرے علاقوں میں جاتا ہے۔ تاجر حضرات الرسالہ میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں۔

مسلمانوں کا علمی وذہنی انحطاط بارہویں و تیرھویں صدی سے شروع ہوا اور سترھویں صدی میں ہم کشف الظنون کے مولف اور قدیم طرز کے عالم حاجی خلیفہ (م ۱۶۵۷) کو علم کلام اور علوم عقلی کے عام انحطاط پر ماتم کناں پاتے ہیں۔ اپنی کتاب میزان الحق فی اختیار الحق میں یہ کہتے ہوئے کہ امام غزالی و امام فخر الدین رازی، قاضی بیضاوی و شیرازی و قطب الدین رازی و سید شریف جرجانی اور جلال الدین دوانی اور ان سب کے تلامذہ اپنے عہد کے جیّد عالم اور مانے ہوئے صاحب فکر و نظر تھے۔ لیکن انھوں نے کسی لمحہ بھی یہ گوارہ نہیں کیا کہ وہ علم و فن کی کسی ایک ہی شاخ کے ہوکر رہ جائیں، حاجی خلیفہ نے لکھا ہے۔

"لیکن بہت سے غبی لوگ اس بنیاد پر کہ یہ علوم عقلی کبھی ممنوع قرار دئے گئے تھے چٹانوں کی مانند جامد رہے اور قدماء کی اندھی تقلید کے قیدی بن گئے بغیر سوچے ہوئے کہ حقیقت حال کیا ہے انھوں نے نئے علوم کی طرف سے نہ صرف یہ کہ آنکھیں پھیرلیں بلکہ انھیں پورے طور پر رد کر دیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو عالم سمجھا حالانکہ وہ نرے جاہل تھے۔ اس کے شوقین کہ اس چیز کا مذاق اڑائیں جسے وہ فلسفیانہ علوم تصوّر کرتے تھے حالانکہ انھیں اس کی خبر نہ تھی کہ زمین کیا چیز ہے اور آسمان کیا ہے۔ اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض۔ قرآن کریم کی اس ہدایت کا ان پر کوئی اثر نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کائنات اور اس فضائے بسیط کو دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ انھیں گائے کی مانند گھورا جائے۔"

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے ۱۸۷۸ء

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

وہ سیاست میں الجھ گئے، حالانکہ ضرورت یہ تھی کہ اسلام کی فطری قوتوں کو بروئے کار لانے کی جدوجہد کی جائے

سے لے کر جب صلحنامہ برلن پر دستخط ہوئے اور جس کے سبب سلطنتِ عثمانیہ کے انتشار و انحطاط میں تیزی پیدا ہوئی۔ خاص طور سے ۱۹۱۱ء سے جب طرابلس پر اٹلی کا حملہ ہوا۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ مسلم دانشور اور مدرسوں کے پڑھے ہوئے علماء سب سیاست کے جال میں ایسے الجھے کہ ملتِ اسلامیہ ہند کی ذہنی و روحانی ضروریات کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ اس سلسلے میں اولین اہمیت کی ضرورت یہ تھی کہ بغیر کسی انحراف و تحریف کے اور دینِ اسلام کے اصولوں کو مستحکم رکھتے ہوئے انھیں کی بنیاد پر روایت اور عہد جدید کے قابلِ قبول تقاضوں کے مابین ربط اور مطابقت پیدا کی جاتی۔ تہذیب اسلام ایک زندہ اور جاندار تہذیب ہے اس نے زمانے کے بے شمار نشیب و فراز دیکھے ہیں، نہ معلوم کتنی آزمائشوں سے یہ گزری ہے۔ پھر بھی زندہ اور باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی فطری قوت متحرکہ کو بروئے کار لایا جائے۔ مسلمانوں کو اس کی شدید ضرورت ہے۔ دنیا بھی اس کی طالب اور منتظر ہے۔ (تلخیص)

انکار کرنے والوں کی نفسیات ہمیشہ ایک رہی ہے

سچائی اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ فطرت کی آواز ہے۔ علم وعقل کے سارے دلائل اس کے حق میں جاتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بے آمیز سچائی سامنے آئے اور اس کے خلاف کوئی مضبوط دلیل قائم کی جاسکے۔ اس کے باوجود ساری تاریخ میں یہ ہوتا رہا کہ جو خدا کا بندہ بھی حق کی دعوت لے کر اٹھا، لوگوں نے اس کا انکار کیا:

افسوس لوگوں پر، جب بھی ان کے پاس کوئی رسول آیا وہ اس کا استہزا کرتے رہے۔

اس انکار حق کی وجہ کیا ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حق کا اعلان، سنت اللہ کے مطابق، ہمیشہ کسی "انسان" کی زبان سے ہوتا ہے، فرشتوں کی زبان سے یا پہاڑوں اور سمندروں کے ذریعے اس کا اعلان نہیں کرایا جاتا۔ اب چوں کہ عام لوگ کسی بات کو اس کی اندرونی قیمت کے لحاظ سے نہیں دیکھ پاتے۔ بلکہ اس سے متاثر ہوتے ہیں کہ بات کو کہنے والا کون ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ہی جیسا ایک آدمی حق کا حامل کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہی جیسا ایک گوشت پوست کا مجموعہ خدا کی اس نعمت سے بہرہ مند کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس کو خدا کی طرف سے سچائی کی معرفت حاصل ہو جائے اور اس کو اس مقام پر کھڑا کیا جائے کہ وہ دوسروں کو حق سے باخبر کرے۔

قرآن میں ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو حق کی دعوت دی تو ان کو قوم کی طرف سے یہ یہ جواب ملا:

يٰهُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۔ ہود - ۵۳

اے ہود تم کوئی دلیل لے کر نہیں آئے ہو اور ہم صرف تمھارے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ تمھاری بات پر یقین کرنے والے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کو حق کا پیغام دیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا:

ان ھذا الا قول البشر مدثر - ۲۵

یہ تو صرف آدمی کا قول ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت حق کا انکار کرنے کی نفسیات ہمیشہ کیا رہی ہے: یہ تو ایک آدمی کی بات ہے جو فلاں شخص کا لڑکا ہے۔ ذاتی حوصلہ مندی نے اس کو اس قسم کے کام کے لئے ابھار دیا ہے (لتکون لکما الکبریاء فی الارض) اس کو یہ جرأت اس لئے ہو رہی ہے کہ کچھ لوگ اتفاق سے اس کو مدد کرنے والے مل گئے ہیں (واعانہ علیہ قوم آخرون) وغیرہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آج آپ کے مخالفین بھی عزت واحترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ کیونکہ آج آپ کے نام کے گرد چودہ سو برس کی عظمتیں قائم ہو چکی ہیں۔ مگر آپ کی زندگی میں، جب کہ یہ تاریخ آپ کے گرد جمع نہیں ہوئی تھی، مکہ کے لوگ آپ کو "ابن ابی کبشہ" کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہوتا تھا: فلاں دیہاتی کا لڑکا۔

نبوت کے ابتدائی سالوں کا واقعہ ہے۔ قریش کے سرداروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر تمھارا پیغام حق ہے اور تم خدا کے رسول ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کردو اور ان میں قصی بن کلاب بھی ضرور ہوں۔ اگر قصی بن کلاب نے زندہ ہو کر کہہ دیا کہ وہی بات حق ہے جو تم کہتے ہو تو ہم ضرور مان لیں گے۔ اس مطالبہ کی نفسیات یہی تھی کہ اس وقت قریش کی روایات کے مطابق قصی بن کلاب کے حق میں تاریخی عظمتیں قائم ہو چکی تھیں جبکہ "محمد بن عبداللہ" ابھی ایک نوخیز شخص تھے۔ انھیں مکہ کے معاشرہ میں اس قسم کی عظمت کا مقام ابھی حاصل نہیں ہوا تھا۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ "ظاہر" کو دیکھ کر رائے قائم کرتا ہے، کسی حقیقت کو وہ اس وقت تک تسلیم نہیں کرتا جب تک اس کے گرد ظاہری لوازم جمع نہ ہو چکے ہوں۔ حالاں کہ اصلی یافت یہ ہے کہ آدمی حقیقت کو اس وقت دیکھ لے جب کہ وہ معنوی شکل میں ہوتی ہے۔ جب اس کے گرد زخارف کا انبار اکھٹا ہو جائے، اس وقت کا دیکھنا معتبر نہیں۔ اس وقت تو ایک اندھا بھی ہاتھوں سے ٹٹول کر حقیقت کو پا لیتا ہے۔

درخواست کے بغیر

ڈاکٹر پی۔ ایل۔ بھٹناگر (۱۹۷۶) نے ۱۹۳۳ء میں ایم ایس سی میں ٹاپ کیا تو گھر والوں کی بہترین تمنا یہ تھی کہ وہ آئی سی ایس کے مقابلہ میں بیٹھیں۔ اس وقت ممتاز طالب علموں کے لئے سب سے زیادہ پرکشش چیز یہی تھی۔ مگر ڈاکٹر بھٹناگر کے علمی شوق نے انھیں مجبور کیا کہ وہ آئی سی ایس افسر بننے کے بجائے ٹیچر اور اسکالر بننے کو ترجیح دیں۔

۱۹۵۶ کا واقعہ ہے پروفیسر ہمایوں کبیر وزارت تعلیم میں سکریٹری تھے۔ ان کو ایک ایسے قابل ریاضی داں کی تلاش تھی جس کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور میں اپلائیڈ میتھمیٹکس کے شعبہ کا صدر بنایا جاسکے۔ انٹرویو کے لئے سلکشن کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر خود ہمایوں کبیر تھے۔ کمیٹی کو درخواست دہندگان میں کوئی بھی شخص عہدہ کے لائق نہ ملا۔

پروفیسر ہمایوں کبیر نے پروفیسر ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری سے کہا جو کہ سلکشن کمیٹی کے ممبر بھی تھے: "کیا ہمارے ملک میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اس عہدہ پر بیٹھنے کے لائق ہو"۔ کوٹھاری نے کہا: "کم از کم ایک شخص تو مجھے معلوم ہے، اور وہ ڈاکٹر بھٹناگر ہیں"۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے فوراً ڈاکٹر بھٹناگر کے نام اپائنٹمنٹ لیٹر بھیج دیا، اگرچہ موصوف نے اس عہدہ کے لئے کوئی درخواست نہیں دی تھی۔

ڈاکٹر بھٹناگر نے ٹیچر کے مقابلہ میں صدر بننے کی پیش کش کو بجبر قبول کیا تھا۔ تاہم وہ ان کے لئے مزید عہدوں کا زینہ بنا۔ وائس چانسلر راجستھان یونیورسٹی اور جے پور یونیورسٹی، ممبر یونین پبلک سروس کمیشن۔ ۱۹۶۸ میں ان کو پدم بھوشن کا خطاب دیا گیا۔ یہ تقریب ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں انجام پائی تھی جو اس وقت صدر جمہوریہ ہند تھے۔

جدید تاریخ کا ایک صفحہ

ترکی مشرق و مغرب کا سنگم ہے اس لیے مغربی تہذیب سے تصادم کا مسئلہ سب سے پہلے یہیں پیش آیا۔ مگر اس کے جواب میں کیا ہوا۔ ایک طرف قدیم علماء کا گروہ تھا جو مغرب کی طرف سے آنے والی ہر چیز کا اس درجہ مخالف تھا کہ سلطان سلیم ثالث (۱۸۰۷-۱۷۸۹) اور اس کے جانشین سلطان محمود (۱۸۳۹-۱۸۰۸) کی نئی فوجی تنظیمات اور ان جدید اصلاحات تک کی مخالفت کی جو انھوں نے ترکی کو عسکری اور علمی لحاظ سے یورپ کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے دوش بدوش لے چلنے کے لیے نافذ کی تھیں۔

دوسری طرف ترکی کی وہ نئی نسل تھی جو پیرس اور برلن اور لندن کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر کے آئی تھی، وہ ترکی کو مغرب کے رنگ میں رنگ دینا چاہتی تھی۔ ان کی انتہا پسندی کا عالم یہ تھا کہ انھوں نے مغربی تقلید کے جواز کے لیے ایک پورا فلسفہ بنا ڈالا۔ ضیاء گوک الپ نے کہا:

"مغربی تہذیب درحقیقت بحر روم کی تہذیب کا امتداد ہے، اس تہذیب (جس کو ہم بحیرہ روم کے منطقہ کی تہذیب کہتے ہیں) کے بانی سماری، سیتھی، فنیقی، رعاۃ، ترکی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

تاریخ میں قدیم زمانوں سے پہلے ایک طورانی دور کا وجود ملتا ہے، اس لیے کہ وسط ایشیا کے قدیم باشندے ہمارے اجداد تھے۔ اس کے بعد مسلمان ترکوں نے اس تہذیب کو ترقی دی اور اس کو یورپ تک پہنچایا، پھر مغربی و مشرقی سلطنت روما کے خاتمہ کے بعد ترکوں نے یورپ کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا، اور اسی بنیاد پر ہم مغربی تہذیب کا جزو ہیں اور ہمارا اس میں حصہ ہے۔"

ان کا منتہائے فکر یہ تھا کہ "وہ اپنے دماغ سے کام لے کر اپنے کو مغرب کی روشن اور بلند پایہ تہذیب میں نصب کر لیں" (عرفان اورگا، اتاترک، ۲۹۷) کمال اتاترک (۱۹۳۸-۱۸۸۱) جب ۱۹۲۴ میں ترک جمہوریہ کے پہلے صدر مقرر ہوئے تو ان کے نزدیک جو سب سے اہم کام تھا وہ یہ کہ ترکوں کو مغرب کا لباس پہنا دیں۔ انھوں نے پردہ کو خلاف قانون قرار دیا۔ عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف جاری کیے۔ عربی میں اذان ممنوع ہوگئی۔ ہیٹ کا استعمال لازمی قرار دے دیا گیا۔ حتیٰ کہ جب ایک خوں ریز انقلاب کے بعد ہیٹ کی جنگ جیت لی گئی تو مصطفےٰ کمال نے مکہ کی موتمر اسلامی (۱۹۲۶) میں شرکت کے لیے ترک پارلیمنٹ کے ایک ممبر ادیب ثروت کو اس حال میں روانہ کیا کہ وہ اس کے واحد مندوب تھے جو اپنے سر پر مغربی ہیٹ رکھے ہوئے تھے۔ یہ گویا ترکی کی فتح عظیم کا اعلان تھا۔

یہی مثال ہر مسلم ملک میں پیش آئی ہے۔ ان میں ڈگری کا فرق تو ہو سکتا ہے مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔ ہر جگہ یہی ہوا کہ قدیم مذہبی طبقہ نے مغرب سے نفرت اور اجتناب میں زندگی کا راز بتایا اور جدید تعلیم یافتہ نے مغرب کی تقلید سے یہ امید کی کہ وہ دوبارہ بام عروج پر پہنچ جائیں گے۔ مگر یہ مثال کہیں نظر نہیں آتی کہ کچھ لوگ شدت سے اس پہلو کی طرف قوم کو متوجہ کر رہے ہوں کہ قوت و طاقت کے اس راز کو معلوم کرو جس سے مسلح ہو کر مغرب تمہارے اوپر اور دنیا کے اوپر چھا رہا ہے

ایک غلطی سارے امکان کو برباد کر دیتی ہے

ایک بار میں ایک دیہات میں گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک شخص نے نیم کا درخت کاٹا اور اس کے بعد اس کے تنہ کا چھلکا اتارنے لگا۔

"آپ اس کا چھلکا کیوں اتار رہے ہیں" میں نے دیہات کے اس آدمی سے پوچھا۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا: "اگر چھلکا نہ اتارا جائے تو اس کے اندر کیڑے لگ جائیں گے اور لکڑی کو خراب کر دیں گے۔" یہ دس سال پہلے کی بات ہے۔ اگست ۱۹۷۵ میں دوبارہ مجھے ایک اور دیہات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ نیم کا ایک کٹا ہوا تنہ پڑا ہے۔ ایک شخص نے اپنے گھر کے پاس نیم کا ایک درخت کاٹ دیا تھا مگر اس کا چھلکا نہیں اتارا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے دس سال پہلے والی بات یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ تجربہ کرکے دیکھوں کہ اس کی بات صحیح تھی یا نہیں۔ میں نے اس کے گھر کے ایک آدمی سے کہا کہ کوئی اوزار لاؤ اور اس کا چھلکا اتارو۔ جب اس نے چھلکا اتارا تو میں نے دیکھا کہ چھلکے کے نیچے ایک انچ کے موٹے موٹے کیڑے ہیں۔ یہ کیڑے نہایت نرم تھے مگر انھوں نے تنہ کی سطح کو جگہ جگہ اس طرح کاٹ ڈالا تھا جیسے اس کے اوپر نالیاں بنائی گئی ہوں۔

یہ قدرت کا نظام ہے۔ قدرت اس طرح سبق دیتی ہے کہ اس دنیا میں تم کو نہایت محتاط رہ کر زندگی گزارنی ہے۔ کیونکہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں ایک غلطی تمھاری ساری خوبیوں پر پانی پھیر سکتی ہے۔ ایک غفلت تمھارے سارے امکانات کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔ قدرت یہ کر سکتی تھی کہ چھلکا اتارے بغیر نیم کے تنہ کو محفوظ رکھتی۔ مگر اس نے یہ قانون بنادیا کہ اس کا مالک اس کا چھلکا اتارے۔ اس کے بعد ہی اس کا تنہ اس دنیا میں محفوظ رہ سکے گا۔

اس قانون قدرت کا انطباق اب انسانی زندگی میں دیکھئے۔

۱۹۴۴ میں جون پور (یوپی) کے دو آدمیوں نے مل کر کاروبار شروع کیا۔ ابتدائی سرمایہ ان لوگوں کے پاس چند سو سے زیادہ نہیں تھا۔ مگر ان کے مشترکہ کاروبار میں خدا نے برکت دی اور چھ سال میں ان کے کاروبار کی حیثیت ۳۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ اب دونوں میں اختلاف شروع ہوگیا اور نتیجہ علیحدگی تک پہنچا۔ ایک ثالث کے مشورہ سے طے ہوا کہ کاروبار تقسیم نہ کیا جائے، بلکہ اس کی مالیت کا اندازہ کر کے اس طرح بٹوارہ ہو کہ ایک شخص نصف کے بقدر رقم لے اور دوسرے کو اثاثہ سونپ دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایک شخص کو مال واسباب اور دوسرے کو نقد پندرہ ہزار روپے دے دیئے گئے۔

۱۹۴۹ میں پندرہ ہزار روپے آج کی قیمت کے لحاظ سے ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھے۔ جس شخص نے نقد رقم لی تھی، اس نے جون پور کے ایک بازار میں کپڑے کی دکان کھول لی۔ انھیں شروع ہی سے بڑا اچھا میدان ملا اور ایک سال میں ان کا سرمایہ دگنا ہوگیا۔ اپنے کاروبار کے دوسرے سال میں وہ اس طرح داخل ہوئے کہ ان کے سامنے ترقی اور کامیابی کا ایک نہایت وسیع دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مگر اب ایک کمزوری نہایت آہستگی سے ان کے اندر داخل ہوگئی۔ وہ خرچ کے بارے میں لاپروا

ہوگئے ۔ اپنی ذات پر، بیوی بچوں پر اور دوستوں پر ان کا خرچ بے حساب بڑھ گیا۔ وہ بھول گئے کہ دن بھر کی بکری سے ایک ہزار روپے جو ان کے گلہ میں آئے ہیں، ان میں سے صرف ۱۰ فی صد ان کا ہے۔ باقی ۹۰ فی صد مہاجن کا ہے۔ وہ اپنے گلہ کی رقم اس طرح خرچ کرنے لگے گویا یہ سارا روپیہ ان کی آمدنی ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے وکیل کی جیب میں فیس کی جو رقم آتی ہے وہ سب اس کی آمدنی ہوتی ہے۔

دکان داری کے ساتھ اس قسم کی شاہ خرچی نہیں چل سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال میں وہ دیوالیہ ہوگئے۔ ان کے پاس پندرہ ہزار میں سے ایک روپیہ بھی باقی نہ رہا۔ اس واقعہ کے بعد وہ تقریباً پندرہ سال تک زندہ رہے۔ مگر دوبارہ کوئی کام نہ کر سکے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ تبلیغ میں "چلہ" دے دو تو تمھارا کام بن جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کیا۔ مگر واپسی کے بعد پہلے سے بھی زیادہ برا حال ہوگیا۔ یہاں تک کہ پریشانی کے عالم میں وہ ۱۹۷۱ میں ایک جیپ سے ٹکرا گئے اور سڑک ہی پر ان کا انتقال ہوگیا۔

یہ ایک انفرادی واقعہ ہے جس میں نظر آرہا ہے کہ زندگی میں ایک غلطی کس طرح سارے امکان کو برباد کر دیتی ہے اور آدمی کو ناکامی کے آخری کنارے پہنچا دیتی ہے۔

اب ایک قومی مثال لیجئے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کا مصری حکمراں خدیو اسماعیل پاشا (۱۸۳۰—۱۸۹۵) نہایت اعلیٰ صلاحیت کا مالک تھا۔ اس نے ایسی پالیسی اختیار کی کہ مصر عملی طور پر ترکی سے آزاد ہوگیا۔ بحر احمر اور بحر روم کو ملانے کے لئے نہر سوئز کا منصوبہ جو ۱۸۶۶ میں بنا وہ اس لئے مکمل ہو سکا کہ اس وقت کے اس مصری حکمراں نے اس تجویز کی اہمیت کو سمجھ لیا اور اس کی منظوری دے دی۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے مصر میں ۱۸۶۷ میں اسمبلی کے طریقے کو رائج کیا۔ اس کی زندگی میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو اس کی اعلیٰ صلاحیت کو ثابت کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسمٰعیل پاشا اس قدر ناکام ہوا کہ ۱۸۷۹ میں اس کو اپنے بیٹے توفیق پاشا کے حق میں تخت و تاج چھوڑنا پڑا۔

اس ناکامی کی واحد وجہ خدیو اسماعیل پاشا کا حد سے بڑھا ہوا اسراف تھا۔ مصر میں اپنی روزمرہ فضول خرچیوں کے علاوہ جب وہ باہر (ترکی، فرانس وغیرہ) جاتا تو وہاں بے تحاشا دولت برباد کرتا۔ بعض مورخین نے اندازہ لگایا ہے کہ اس کے قرضوں کی مقدار ۱۰۰ ملین پونڈ تک پہنچ گئی تھی۔ مزید یہ کہ ملک کے بیت المال، خیراتی اوقاف اور یتیموں اور بیواؤں کے فنڈ سے بھی اس نے قرض لے رکھا تھا جو تقریباً ۵۳۷۰۰۰ پونڈ کے برابر تھا۔ ان قرضوں کی ادائیگی کے لئے اس نے مصری عوام کے اوپر ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانے میں چالیس قسم کے ٹیکس نافذ تھے۔ عبدالرحمٰن الرافعی کی کتاب اسماعیل اور یوسف نحاس کی کتاب الفلاح میں اس کے ٹیکسوں کی جو تفصیل درج ہے وہ انتہائی ہیبت ناک ہے۔ مثلاً قدیم مصری کسان ایک لباس پہنتے تھے جس کو زعبوط کہا جاتا تھا۔ اسمٰعیل پاشا کی حکومت نے اس کپڑے پر بھی ٹیکس لگا دیا۔ ایک زعبوط پر ایک ریال ٹیکس تھا۔ ادائگی کے وقت زعبوط کی آستین پر ایک مہر ڈالی جاتی تھی۔ بدقسمتی یہ تھی کہ یہ مہر پانی لگنے سے چھوٹ جاتی تھی۔ اس لئے کسان اپنے زعبوط کو دھوتے ہوئے اس کے مہر کے حصے کو چھوڑ

دیتا۔ کیونکہ معلوم تھا کہ ٹیکس وصول کرنے والے جو ہر وقت بازاروں میں گھومتے رہتے تھے مہر کا نشان مٹتے ہی اس کے اوپر دوسرا ریال لگا دیں گے۔ ٹیکسوں کی اس کثرت کے باوجود یہ حال تھا کہ دو سال تک سرکاری ملازموں اور فوجیوں کو تنخواہیں نہ دی جاسکیں۔

مگر قرض کی ادائگی کے لئے یہ سارے ٹیکس بھی ناکافی ثابت ہوئے۔ کیونکہ اسماعیل پاشا کا اسراف بھی اسی کے ساتھ برابر جاری تھا۔ آخر وہ اندوہناک واقعہ ہوا جس نے مصر کی تاریخ بدل ڈالی۔ اسماعیل پاشا نے قرضوں کی ادائگی کے لئے نہر سوئز میں حکومت مصر کے حصہ کو ۱۸۷۶ میں انگلستان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جب اس سے بھی قرضوں کا بوجھ ختم نہ ہوا تو اس نے فرانس کے قرضوں کے معاوضہ میں فرانس کو انگلستان کے ساتھ سوئز میں شریک قرار دے دیا۔ اور سوئز کے اوپر جہاں پہلے انگلستان اور مصر کا کنٹرول تھا، اب فرانس اور انگلستان کا کنٹرول قائم ہوگیا اور اسی کے ساتھ مصر میں ان کی سیاست کے داخلہ کا دروازہ بھی کھل گیا۔ جمال عبدالناصر کا ۱۹۵۶ میں سوئز کو نیشنلائز کرنا، اسماعیل پاشا کی اسی غلطی کی اصلاح تھا۔ مگر صدر ناصر نے یہ دوسری غلطی کی کہ اسراف کی اصلاح ناعاقبت اندیشانہ اقدام سے کرنی چاہی جو مصر کے حق میں پہلے سے بھی زیادہ مہنگی ثابت ہوئی۔

زندگی، خواہ افراد کی ہو یا قوموں کی، نہایت نازک امتحان ہے۔ یہاں ہر ایک کے حوصلہ اور ہوش مندی کی جانچ ہو رہی ہے۔ ہمیں ہر وقت چوکنا رہنا ہے۔ کیونکہ کوئی ایک غلطی بھی اتنی فیصلہ کن ہوسکتی ہے کہ ہماری ساری امیدوں پر پانی پھیر دے اور ہمارے لئے بالآخر حسرت و یاس کے سوا اور کچھ نہ چھوڑے ■

ابو عبداللہ لسان الدین معروف بہ ابن الخطیب (۷۷۶ – ۷۱۳ھ) غرناطہ میں پیدا ہوا۔ عربی زبان وادب، علوم دینیہ، فلسفہ و طب، ریاضی و تاریخ میں وقت کی اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی۔ مگر حاکم غرناطہ ابوالحجاج یوسف (۷۵۵ – ۷۳۳ھ) کے دربار میں اس کو جس چیز نے پہنچایا، وہ اس کی ادب وشاعری تھی۔ سلطان نے اس کو اپنا سکریٹری بنا لیا۔ اس کے بعد اس کو وزیر کا منصب عطا ہوا۔ ابوحجاج کے بعد اس کا بیٹا محمد خامس تخت نشین ہوا تو اس نے بھی اس کو وزارت پر بحال رکھا۔ مگر اس کی ترقی نے اس کے حاسدوں کی تعداد بہت بڑھا دی۔ انھوں نے بادشاہ کو اس کے خلاف بدگمان کر دیا۔ وہ غرناطہ سے بھاگ کر افریقہ پہنچا۔ یہاں بھی ابتداءً اس کی عزت وتکریم ہوئی۔ اس کے بعد کچھ لوگوں نے فقہا کو اس کے خلاف بھڑکایا۔ انھوں نے اس کے الحاد کا فتوی دے دیا۔ چنانچہ کچھ جوشیلے لوگ دیوار پھاند کر اس کے گھر میں گھس گئے اور گلا گھونٹ کر اس کو مار ڈالا۔

کہا جاتا ہے کہ جس طرح افریقہ میں علم وادب کی امامت ابن خلدون پر ختم ہوگئی اسی طرح اندلس میں علم وادب کی امامت ابن الخطیب پر ختم ہوئی۔ ابن الخطیب کا تاریخ میں بہت بلند مقام تھا۔ اس نے تقریباً ۶۰ تصنیفات چھوڑی ہیں۔ الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ (تین جلدیں) غرناطہ کی شخصیتوں کے لئے تاریخی ڈکشنری کی حیثیت رکھتی ہے۔

زمین کے اندر سے تیل نکالنے کا کام، جدید تاریخ میں ۱۸۵۹ میں شروع ہوا جب کہ امریکہ کے ایڈون ایل۔ ڈریک نے پنسلوانیا میں ۷۰ فٹ کی گہرائی سے تیل نکالنے میں کامیابی حاصل کی۔ شرق اوسط میں تیل کی دریافت پہلی بار ۱۹۰۸ میں مسجد سلیمان میں ہوئی۔ اس وقت عرب دنیا پر ترکوں کی حکومت تھی۔ مغربی کمپنیوں نے عثمانی سلطنت سے اس علاقہ میں تیل نکالنے کی خصوصی مراعات حاصل کرلیں۔

جدید صنعتی دنیا کی قوت اور ترقی کا راز یہی تیل ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے زراعت کے لئے پانی اور انسانی جسم کے لئے خون ہوتا ہے۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اس قدرتی دولت کا بڑا حصہ اسی زمین کے نیچے دفن ہے جس کو شرق اوسط یا خلیج فارس کے ممالک کہا جاتا ہے۔ موجودہ صدی کے آغاز سے لے کر اب تک یہ دولت تمام تر مغرب کی صنعتی قوموں کے قبضہ میں رہی ہے۔ ان قوموں کی ترقی کا اصل راز وہ سستا ایندھن تھا جو انھیں نہایت آسانی سے مسلسل شرق اوسط سے مل رہا تھا۔ مسلم دنیا کے تیل سے طاقت ور ہو کر وہ مسلم دنیا کے اوپر چھائے رہے۔

اکتوبر ۱۹۷۳ کی جنگ میں تیل کے حربہ کا استعمال وہ بھی شعوری طور پر نہیں بلکہ زیادہ تر "گربہ عاجز" کی نفسیات کے تحت، پہلا تجربہ تھا، جب کہ لوگوں کو معلوم ہوا کہ تیل ایک طاقت ہے، اتنی بڑی طاقت کہ اس کا جزوی استعمال بھی پوری صنعتی دنیا کو ہلا سکتا ہے۔

آج شرق اوسط کی زمین سے جو تیل نکالا جا رہا ہے، اس کی قیمت ۲۰ کروڑ ڈالر سالانہ سے بھی زیادہ ہے۔ دولت کے اس سیلاب نے خلیج فارس کے ملکوں کو اچانک اس قدر مالا مال کر دیا ہے کہ تعیشات کی ہر قیاسی مد اس کے استعمال کے لئے ناکافی ہے۔ عالمی بنک کے اندازہ کے مطابق ۱۹۸۵ تک تیل کے ممالک کے پاس، تمام ممکن مدوں میں مسرفانہ حد تک خرچ کرنے کے بعد بھی، ایک ٹریلین ڈالر کے بقدر فاضل رقم موجود ہو گی۔

تیل کی دولت کے اس ارتکاز کو جغرافی اتفاق (ACCIDENT OF GEOGRAPHY) کہا جاتا ہے۔ مگر ماہرین ارضیات کے اس قیاس سے زیادہ یقینی بات وہ ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ قرآن کے مطابق، اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ تمام تر خدائی فیصلہ کے تحت ہوتا ہے، خواہ ظاہری آنکھوں کو واقعات کے پیچھے خدائی ہاتھ کام کرتا ہوا نہ دکھائی دے۔

خدا نے یہ دولت مسلم ممالک کو کیوں دی ہے، اس پر غور کیا جائے تو سب سے پہلے یہ حدیث ہمارے سامنے آتی ہے:

یوشك ان یحسر الفرات عن کنز من ذهب

پاکستان سے تقریباً چار سو خاکروب سعودی عرب بھیجے گئے ہیں۔ سعودی عرب کے اخبار الریاض (۲۳ دسمبر ۱۹۷۶) کا یہ کارٹون اسی پس منظر میں ہے۔ ایک عرب پاکستانی خاکروب کو عربی آمیز اردو میں کوڑا کرکٹ کی صفائی کے لئے ہدایات دے رہا ہے۔ *
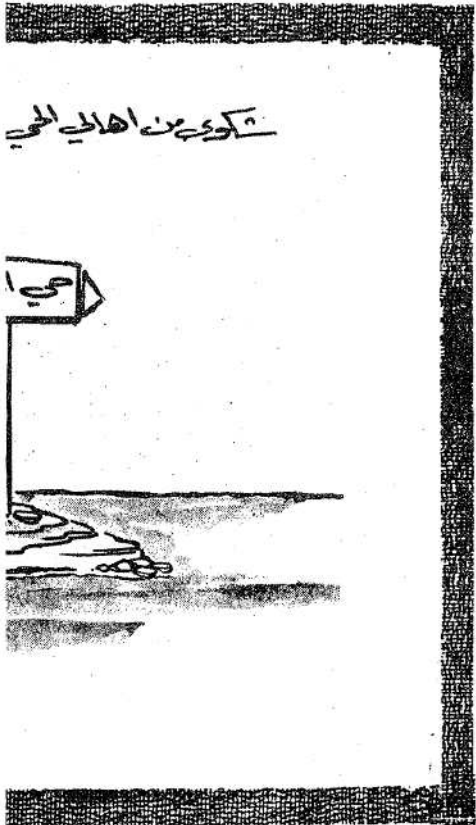
فمن حضره فلا یاخذ منه شیئا

قریب ہے کہ فرات سے سونے کا خزانہ نکلے۔ اس وقت جو موجود ہو وہ اس میں سے کچھ نہ لے۔

یہ حدیث غالباً اسی سیال سونا (LIQUID GOLD) کے بارہ میں ہے جس کو تیل کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قدرتی دولت جو خلیج فارس کے علاقہ میں ظاہر ہوگی، وہ ذاتی عیش کے لئے نہ ہوگی۔ اس کے بعد جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حرم کی توسیع اور مقامات مقدسہ کی عمارتی تزئین کے لئے ہے، ان کو قرآن کی سورہ توبہ آیت ۱۹ (اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ الخ) کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

اصل یہ ہے کہ تیل کا یہ قدرتی خزانہ مسلمانوں کی صنعتی پس ماندگی کی تلافی ہے۔ موجودہ دور میں مسلمان صنعت و تجارت میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ بعض مغربی ماہرین کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ یہ ممالک اب کبھی بھی، اقتصادی حیثیت سے، مغربی اقوام کے برابر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہزار کوششوں کے بعد جب وہ صنعتی دور (INDUSTRIAL AGE) میں پہنچیں گے تو ترقی یافتہ دنیا مافوق صنعتی دور (SUPER INDUSTRIAL AGE) میں پہنچ چکی ہوگی۔

تیل کی دولت کے ظہور نے صورت حال کو اچانک طور پر بدل دیا ہے۔ عالمی بنک کی رپورٹ نمبر ۷۷۴ (۱۹۸۴) کے مطابق پٹرولیم برآمد کرنے والے اوپیک ممالک کے ہاتھ میں آج تیل کی عالمی تجارت کا ۸۵ فی صد حصہ ہے۔ اس طرح انھوں نے جدید دنیا میں کلیدی اقتصادی پُرزہ (ECONOMIC LEVERAGE) کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

مسلم ملکوں کے پاس تیل کی دولت کے ظہور نے انھیں اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ اس مشن کی انجام دہی کی بڑی سے بڑی قیمت دے سکیں جو خدا نے ان کے ذمہ کیا ہے۔ یہ مشن ہے دنیا کی قوموں کو خدا کے پیغام سے باخبر کرنا۔ لوگوں کو بتانا کہ مرنے کے بعد وہ اپنے مالک کے

پاس جانے والے ہیں اور وہاں ان کا رب ان کے اعمال کا حساب لے گا۔

مسلمان جدید دور میں، اقتصادی حیثیت سے، اپنے مشن کو اعلیٰ معیار پر انجام دینے کے قابل نہ رہے تھے۔ خدا نے ان کو صنعتی دور کا خزانہ دے کر ان کا یہ عذر ختم کر دیا۔ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ٹھیک ویسا ہی ایک معاملہ ہے جو بنی اسرائیل کے ساتھ چار ہزار برس پہلے پیش آیا تھا۔ بنی اسرائیل جب مصر کے زرخیز علاقے سے نکل کر صحرائے سینا میں پہنچے تو وہ تمام اقتصادی ذرائع سے محروم ہو چکے تھے۔ اس وقت بیابان میں من و سلویٰ اتار کر خدا نے ان کی اقتصادی محرومی کی تلافی کر دی۔ یہ نصرت الٰہی کی غیر معمولی صورتیں ہیں۔ اس کے بعد بھی جو قوم اپنی دینی ذمہ داریوں کو ادا نہ کرے۔ وہ خدا کی نظر میں اتنی بڑی مجرم ہو جاتی ہے جس کے بعد کوئی بھی عذر سنا نہیں جاتا۔ حامل کتاب قوم کے لئے مواقع کار کی فراہمی اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے، مگر اس کے بعد کا کام تو بہر حال خود ہم کو انجام دینا پڑے گا۔ مواقع کار جتنے زیادہ ہوں، ذمہ بھی اتنی ہی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

سوال وجواب

"میں الرسالہ کو باقاعدہ خرید کر پڑھ رہا ہوں۔ مجھے آپ کی بہت سی باتوں سے مکمل اتفاق ہے۔ ان کی تفصیل میں بالکل نہیں جاؤں گا۔ میں آپ کی توجہ الرسالہ جنوری ۱۹۷۷ میں "ایک خاندانی جھگڑا جو پوری تاریخ پر چھا گیا" کے عنوان سے جو مضمون چھپا ہے اس کے چند اقتباسات کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ "۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خلافت راشدہ کے آخر میں آپس کی لڑائیاں شروع نہ ہو گئی ہوتیں تو طاقت وقوت کا بے پناہ سیلاب جو عرب سے اٹھا تھا ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تمام علاقوں کو توحید کا علاقہ بنا دیتا"، بلاشبہ ان لڑائیوں سے تحریک اسلامی کو زبردست نقصان پہنچا۔ مگر اس قسم کی تحریر سے اگر کوئی بھی شخص یہ سمجھے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا تو کیا وہ غلط ہو گا؟

"حضرت عمرؓ اپنے بعد علیؓ بن ابی طالب کو موزوں ترین شخص سمجھتے تھے۔ مگر اسی اندیشہ کی بنا پر وہ آنجناب کو نامزد نہ کر سکے"۔ اس طرح کے اندیشہ کا ٹھوس ثبوت کیا ہے؟ سوال یہ بالکل نہیں کہ خلافت کے لئے موزوں ترین شخص حضرت علیؓ تھے یا عثمانؓ۔ سوال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے محتاط اور زبردست قوت ارادی والے شخص (جس نے حضرت خالدؓ بن ولید کو سپہ سالاری سے صرف اس لئے معزول کر دیا تھا کہ مسلمان یہ نہ سمجھنے لگیں کہ فتح خالدؓ کی وجہ سے ہو رہی ہے) سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ وہ محض ایک سیاسی مصلحت کی بنا پر تحریک اسلامی کو ایک موزوں ترین شخص کی لیڈرشپ سے محروم کر دیتے۔

(مذکورہ مضمون سے اس طرح کے چند اور اقتباسات نقل کرنے کے بعد)

اچھے تاریخ دان اس طرح کے COMMENTS کو پسند نہیں کرتے۔ میں خود بھی تاریخ کا طالب علم ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ HISTORICAL GENERALISATIONS میں ایسی غلطیاں بہت عام ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے تاریخ کے چند HARD FACTS پر کوئی بھی نظریہ قائم کرتے وقت اسے TENTATIVE ہی سمجھنا چاہئے اور بہت ہی احتیاط

کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اب کوئی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ مولانا وحیدالدین خاں جیسے جید عالم کا بھی یہ خیال..... ہے۔ بے شک خیال کی حد تک ہر شخص آزاد ہے۔ مگر اس طرح کے GENERALISATIONS بعض زبردست غلط فہمیوں کا موجب ہوتے ہیں۔

توقیر احمد ایم اے
۳۴۳-اے، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

جواب: تاریخی جنرلائزیشن کے بارہ میں آپ کا ارشاد بجا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ تاریخ میں اس قسم کے جنرلائزیشن سے بچنا ممکن نہیں۔ تاریخ کے کسی واقعہ پر یا مجموعہ واقعات پر جب بھی آپ کوئی حکم لگائیں یا اس کو کوئی تعبیر دینے کی کوشش کریں گے تو لازماً آپ اسی مقام پر ہوں گے جہاں آپ نے الرسالہ کے مضمون نگار کو کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے نہ آپ مستثنیٰ ہو سکتے ہیں نہ کوئی دوسرا مورخ۔

مثال کے طور پر مطبوعہ مضمون کے بعض حصوں کو لے کر آپ نے جو اعتراضات کئے ہیں، وہ بھی جنرلائزیشن ہی کی صورتیں ہیں۔ آپ کا یہ کہنا کہ فلاں پیراگراف سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا" یا فلاں عبارت سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ عمر فاروقؓ سیاسی مصلحت کا شکار ہو گئے تھے، یہ سب بھی جنرلائزیشن ہی کی صورتیں ہیں۔ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے آپ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ تاریخ میں اس قسم کی یکسانی رائے ممکن نہیں جو فزکس اور کیمسٹری میں ہوا کرتی ہے۔ تاریخ کو ایک تعبیر دینے والا شخص جس نازک مقام پر ہوتا ہے، ٹھیک اسی مقام پر وہ دوسرا شخص بھی ہوتا ہے جو اس کی تعبیر کو چیلنج کر رہا ہو۔ اس لئے تاریخ میں یہ کہنا بے معنی ہے کہ جنرلائزیشن مت کرو، آپ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے دلائل و شواہد کے ساتھ کسی دوسرے جنرلائزیشن کو پیش کریں جو آپ کے نزدیک واقعات کی زیادہ صحیح تعبیر ہو۔

"تاریخ کے کچھ HARD FACTS پر کوئی نظریہ قائم کرتے وقت اس کو TENTATIVE ہی سمجھنا چاہیے"

آپ کے اس ارشاد سے مجھے اتفاق ہے، صرف اس اضافہ کے ساتھ کہ تاریخ کے بارہ میں ہر نظریہ ہمیشہ TENTATIVE ہی ہوتا ہے، کوئی بھی ایسا نظریہ نہیں، نہ صرف ماضی بلکہ حال کے بارہ میں بھی نہیں، جس کو مطلق صداقت کہا جا سکے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو تو اس کے بارہ میں یہی کہا جائے گا کہ وہ نہ انسانی علم کی حدود کو جانتا اور نہ تاریخ کے موضوع کی نزاکتوں کو۔

تاریخ میں یہ بات ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے آپ کو یہ اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی شخص جب تاریخ کے بارہ میں اپنا حاصل مطالعہ پیش کرے تو آخر میں یہ جملہ بھی لکھ دے: قارئین اس کو محض TENTATIVE سمجھ کر میرے خیالات کا مطالعہ کریں۔

خدا سے ڈر کی پہچان یہ ہے کہ آدمی انسان سے ڈرنے لگے۔ اس معنی میں نہیں کہ جو زور آور ہو یا جس سے کوئی مفاد وابستہ ہو، اس سے آپ ڈریں۔ یہ تو دنیا پرستی بلکہ شرک ہے۔ انسان سے ڈرنے کا مطلب صاحب حقوق سے ڈرنا ہے۔ یہ سمجھ کر لوگوں سے معاملہ کرنا کہ ہر آدمی کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے اور وہ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتا ہے جس کی حق تلفی کی جائے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں

دور جدید اور اس کے مقابلہ میں اسلام کے مسئلہ کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے جبکہ پرتگالیوں نے یورپ اور ہندوستان کے درمیان سمندری راستہ دریافت کرکے بحر ہند اور بحر عرب پر قبضہ کرلیا اور عربوں کی تجارت مشرقی ایشیا سے کاٹ دی۔ سترھویں صدی میں اسٹیم انجن کی دریافت اور اٹھارویں صدی میں جدید سائنس کا وجود میں آنا یورپ کے لئے طاقت کا نیا میدان کھل جانے کے ہم معنی تھا۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ میں جب نہر سوئز بنی اور اس نے بحر روم اور بحر احمر کے درمیان سیدھا راستہ کھول دیا تو عالم اسلام پر مغرب کے غلبہ کا عمل اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ جب تک یہ عمل تجارتی منڈیوں پر قبضہ اور غیر سیاسی میدانوں میں نفوذ کی صورت میں ہو رہا تھا، لوگ اس سے بے خبر رہے۔ مسلم رہنماؤں کو اس واقعہ کی خبر صرف اس وقت ہو سکی جب اس نے اپنے استیلا ر کو مکمل کرکے عالم اسلام کے اوپر اپنا سیاسی جھنڈا لہرا دیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں مسلم دنیا میں مختلف قسم کی تحریکوں کا ظہور ہوتا ہے۔ مگر اس پوری مدت میں جو بے شمار تحریکیں مسلمانوں کے درمیان اٹھیں، تقریباً سب کی سب ردعمل کی نفسیات کے تحت اٹھنے والی تحریکیں نظر آتی ہیں۔ ان میں کوئی تحریک ایسی نہیں ملتی جو ایجابی فکر کے تحت پیدا ہوئی ہو۔ خارجی طاقت کی دراندازی نے مسلم معاشرہ کے لئے جو مسائل پیدا کئے، ان سے متاثر ہو کر کچھ لوگ بس جوابی ذہن کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے وہ اصلاً خارجی حالات کی پیداوار تھے نہ کہ اسلامی تعلیمات اور سیرت رسول پر مثبت غور و فکر کی پیداوار۔

ردعمل کی یہ نفسیات جن جن صورتوں میں ظاہر ہوئی، ان کو سمجھنے کے لئے ہم چار عنوانات کے تحت ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں:

۱۔ مقابلہ آرائی
۲۔ تحفظ
۳۔ احیاء
۴۔ تعمیر و استحکام

مقابلہ آرائی کے ذہن نے سیاسی آزادی کی تحریکوں کی صورت اختیار کی۔ سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ — ۱۸۳۸) سے لے کر ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ — ۱۸۸۸) تک بے شمار ایسے قائدین پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے پوری مسلم دنیا کو جوش و خروش سے بھر دیا۔ جمال الدین افغانی کا نعرہ تھا: مصر للمصریین (مصر مصریوں کے لئے)۔ لیبیا میں اٹلی کے سیاسی اقتدار (۴۳ — ۱۹۱۱) کے زمانہ میں سلیمان البارونی نے آواز لگائی: موتوا الیوم اعزاء قبل ان تموتوا غدا اذلاء (آج عزت کے ساتھ مرجاؤ قبل اس کے کہ کل تم ذلت

کے ساتھ مرو)۔ الفاظ بدل کر اس دور کے تمام سیاسی لیڈروں کا نعرہ یہی تھا۔ کروروں لوگوں نے اجنبی اقتدار سے رہائی حاصل کرنے کے نام پر اپنی جانیں دے دیں اور کھربوں روپے کے نقصانات کو برداشت کیا۔ آج یہ جدوجہد، اپنے مقررہ نشانہ کے مطابق تقریباً تمام ملکوں میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اگرچہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس چیز نے مغربی استعمار سے آزادی کی جدوجہد کو کامیاب بنایا وہ بڑی حد تک خود مستعمرین کی باہمی لڑائیاں تھیں، جزدی طور پر جنگ عظیم اول (۱۸-۱۹۱۴) اور زیادہ بڑے پیمانے پر جنگ عظیم ثانی (۴۴-۱۹۳۹)

تاہم آزادی کی تحریکوں کی کامیابی ان امیدوں کو پورا نہ کرسکی جن کے لئے الجزائر میں ۲۵ لاکھ اور ہندستان میں دو لاکھ مجاہدین نے اپنے کو قربان کر دیا تھا۔ مسلم قوموں پر مغربی قوموں کا غلبہ آج بھی بدستور باقی ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ غلبہ فوجی اور سیاسی معنوں میں تھا، اب اس نے اقتصادی اور صنعتی روپ اختیار کر لیا ہے۔ یہ دوسرا غلبہ اتنا شدید ہے کہ مسلم ملکوں کی سیاسی پالیسیاں بھی حقیقی معنوں میں آزاد پالیسیاں نہیں ہیں۔ وہ عملاً انھیں مغربی قوموں کے ہاتھ میں ہیں جن سے ہتھیار خرید کر وہ اپنا دفاع کرتے ہیں، جن کی ٹکنکل امداد سے وہ اپنے تمدنی شعبوں کو چلا رہے ہیں۔ ان کے اثرات اب بھی اتنے گہرے ہیں کہ وہ جب چاہیں احمد دبلو (۱۹۶۶) یا شاہ فیصل (۱۹۷۵) کو قتل کرادیں۔ اردن (۱۹۷۱) اور شام (۱۹۷۶) کے ہاتھوں فلسطینی تحریک کو کچل ڈالیں۔ ایران کے عوامی انقلاب (۱۹۵۱) کو ناکام بنا دیں۔ مصر کو اپنے اس دشمن سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیں جس کے بارہ میں جمال عبدالناصر (۱۹۷۰-۱۹۱۸) نے فخریہ کہا تھا: نحن ابناء الفراعنہ سنرمیکم فی البحر (ہم فرعونوں کی اولاد ہیں، ہم تم کو سمندر میں پھینک دیں گے) وغیرہ۔

۲۔ تحفظ کی تحریکوں نے عام طور پر تعلیم دین کا رخ اختیار کیا۔ مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴-۱۸۵۷) نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اپنی تقریر میں کہا تھا: "دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ وہ آگے بڑھیں، آگے بڑھیں، ہماری ترقی یہ ہے کہ ہم پیچھے ہٹیں، پیچھے ہٹیں۔ یہاں تک کہ دور نبوت سے جا ملیں"۔ اس ذہن کے تحت تمام ملکوں میں بے شمار مدارس قائم کئے گئے۔ ان مدارس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم نسلوں کو عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دی جائے اور ان کو، کم از کم ذہنی حیثیت سے دور نبوت تک پہنچا دیا جائے۔ توقع یہ تھی کہ جو لوگ ان مدارس میں تربیت پاکر نکلیں گے، وہ زمانہ کے اثرات سے اپنے کو بچانے کے لائق بن سکیں گے۔

یہ تحریک ان معنوں میں پوری طرح کامیاب رہی کہ اس نے ساری مسلم دنیا میں دینی مدرسوں کا جال بچھا دیا اور کوئی بستی ایسی نہ رہی جو ان درس گاہوں میں تعلیم پائے ہوئے علماء و فضلاء سے خالی ہو۔ مگر جہاں تک اسلامی ذہن اور اسلامی طرز فکر کا سوال ہے، ان مدارس کی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے۔ ان مدارس سے فراغت کے بعد جن خوش نصیبوں کو خود ان مدارس یا ان سے ملتے جلتے کسی ادارہ میں جگہ مل گئی، انھوں نے بلاشبہ مدرسہ کے دیئے ہوئے ظاہری لبادہ کو باقی رکھا کیونکہ ان اداروں میں قیام و ترقی کے لئے یہی لبادہ ان کی قیمت تھی۔ مگر جن لوگوں کے حالات انھیں ان اداروں سے باہر لے گئے۔ وہ کسی بھی معنی میں غیر دینی مدارس کے فارغین سے مختلف ثابت نہ ہو سکے۔ کیریرزم ان کا دین بھی رہا اور اُن کا بھی۔

اس کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ دینی تعلیم کے رہنما اس واقعہ کا پوری طرح اندازہ نہ کر سکے کہ اسلامی تعلیم کا مسئلہ، موجودہ زمانہ میں، صرف اسلامی زبان یا اسلامی احکام سے واقف کرانے کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ نظام حاضر کے فکر میں اسلام کو اس کی جگہ دلانے کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے اپنے اداروں میں جو نسل تیار کی، وہ اگرچہ اسلام کے روایتی علوم کی ماہر تھی، مگر اسلام اس کے حقیقی ذہن کا جزو نہیں بنا تھا۔ کیونکہ وہ اس کو اس فکری مستوی کے مطابق دکھائی نہیں دیتا تھا جس کے اندر وہ عملاً سانس لے رہا تھا۔ جو اسلام اسے دیا گیا وہ اس کے لئے ایک قسم کا معلوماتی ضمیمہ تھا نہ کہ فکری غذا۔ ظاہر ہے کہ عالمی افکار کے سیلاب میں کوئی شخص اس قسم کے ذہنی ضمیمہ کو دیر تک باقی نہیں رکھ سکتا۔ دوسرے یہ کہ جدید تبدیلیوں نے مروجہ دینی تعلیم کا رشتہ اقتصادیات سے کاٹ دیا تھا۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کوئی تعلیمی نظام جو اقتصادی بنیادوں سے محروم ہو، زندگی کے نظام میں مؤثر مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

۳۔ احیاء کی تحریکوں سے میری مراد وہ تحریکیں ہیں جو اسلامی نظام کے قیام کا مقصد لے کر اٹھیں۔ انڈونیشیا کی ماشومی پارٹی، مصر کی الاخوان المسلمون، پاکستان کی جماعت اسلامی اس کی مثالیں ہیں۔ ان تحریکوں کا کہنا تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جتنے مسائل پیش آرہے ہیں، وہ صرف اس لئے ہیں کہ اسلامی قانون کی حکومت زمین پر قائم نہیں ہے۔ اگر مسلم ملکوں میں اسلامی قانون کی بنیاد پر معاشرہ کی تنظیم کر دی جائے تو نہ صرف ہمارے تمام اندرونی مسائل حل ہو جائیں گے بلکہ عالمی سطح پر مسلمان دوبارہ وہی مقام حاصل کر لیں گے جو ماضی میں ایک ہزار برس تک انھیں حاصل تھا۔

ان تحریکوں نے اسلام کی تعلیمات کو جس طرح سیاسی اصطلاحوں میں بیان کیا وہ، خاص طور پر موجودہ صدی کے نصف اول کے ماحول میں، بہت سے مسلمانوں کو اسلام کے حق میں وقت کا بہترین قصیدہ معلوم ہوا۔ وہ سیاسی مشاعرہ کے اس اسلامی پنڈال میں آسانی سے جمع ہو گئے۔ تاہم یہ مشاعرہ دیر تک باقی نہ رہ سکا۔ ان تحریکوں کا ذہن چوں کہ اسلام کی سیاسی تشریح سے بنا تھا، قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ وہ بہت جلد اپنے ملکوں کی "غیر اسلامی" حکومتوں سے ٹکرا گئیں۔ یہ ٹکراؤ ہر ایک کے حق میں چھری اور خربوزے کا ٹکراؤ ثابت ہوا۔ مصر کے انور السادات نے اقتدار پر قبضہ کے بعد (۱۹۷۱) اپنے سیاسی حریفوں کو انتباہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ جو میری مخالفت کرے گا، میں اس کو قیمہ بنا دوں گا (حاً فرمہ)۔ مسلم حکمرانوں کے یہ ارادے سب سے زیادہ جن کے حق میں صحیح ثابت ہوئے ہیں، وہ یہی اسلامی نظام کی علم بردار جماعتیں ہیں۔ انھوں نے ہر ملک میں ان جماعتوں کو قیمہ بنا کر رکھ دیا ہے، اب کسی بھی ملک میں ان کا کوئی سیاسی مستقبل نہیں۔

اسلامی نظام کی علم بردار جماعتوں کی یہ ناکامی محض ان کے سیاسی حریفوں کی شقاوت کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس میں خود ان کے رہنماؤں کا یا انتہائی غلط اندازہ شامل ہے کہ انھوں نے سمجھا کہ وہ مقامی مسلمانوں کے ووٹ سے اسلامی حکومت بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ وہ اس تاریخی حقیقت کو بھول گئے کہ حکومتیں ہمیشہ وقت کے غالب افکار

کے جلو میں بنتی ہیں۔ موجودہ زمانہ کا فکری ڈھانچہ تمام تر سیکولر بنیادوں پر قائم ہے۔ ایسی حالت میں کسی کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک میں اسلام کا سیاسی جزیرہ بنا سکے، جب تک وہ زمانی افکار کے ڈھانچہ کو توڑنے میں کامیاب ہوگیا ہو۔

۴۔ تعمیر و استحکام سے میری مراد وہ فکری حلقہ ہے جس کا کہنا یہ تھا کہ اجنبی اقتدار سے براہ راست سیاسی تصادم نہ کیا جائے۔ اس کو بطور چھتری استعمال کرتے ہوئے غیر سیاسی دائروں میں اپنے کام کو جاری رکھا جائے۔

بدقسمتی سے یہی وہ ذہن ہے جو موجودہ دور کے مسلمانوں میں سب سے کم پایا گیا ہے۔ مفتی محمد عبدہ نے پیرس میں زمانہ قیام (۱۸۸۴) سے متعلق اپنے استاد جمال الدین افغانی کا ایک تاثر نقل کیا ہے۔ محمد عبدہ نے ایک گفتگو کے دوران اپنے استاد سے کہا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے سیاسی تصادم کا بظاہر کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ جب کہ دوسری طرف ہمارے لئے کام کا ایک ایسا میدان کھلا ہوا ہے جس میں ہم یقینی نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ہے یورپ اور امریکہ میں اسلام کی تبلیغ۔ ہم کیوں نہ ایسا کریں کہ اپنے کو سیاسی نشانہ سے ہٹا دیں اور خاموشی سے تبلیغ و تعلیم کے کام میں لگ جائیں۔ جمال الدین افغانی کی انقلابی طبیعت کو یہ تجویز حقیر معلوم ہوئی۔ انھوں نے کہا: انما انت مثبط (تم پست حوصلگی کی باتیں کرتے ہو)

اس پورے دور میں تعمیر و استحکام کے مقصد کے تحت اٹھنے والی کوئی قابل لحاظ تحریک نظر نہیں آتی۔ مسلم رہنماؤں کا حال یہ رہا کہ وہ ـــ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" جیسے رومانی تصورات پر فدا ہوتے رہے۔ کسی کی سمجھ میں وہ حقیقت پسندانہ طریق کار نہ آسکا جس کو بدنام طور پر حالی (۱۹۱۴ــ۱۸۳۷) نے ان لفظوں میں بیان کیا تھا:

ـــ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔

ہندستان میں اس سلسلہ میں دو مستثنیٰ مثالیں ملتی ہیں، وہ بھی بدنام شخصیتوں کی۔ میری مراد سر سید احمد خاں (۱۸۹۸ــ۱۸۱۷) اور مرزا غلام احمد قادیانی (۱۹۰۸ــ۱۸۴۰) سے ہے۔ اول الذکر کا کہنا تھا کہ انگریز نے اگرچہ سیاسی کام کا راستہ بند کر رکھا ہے مگر سیاست کے علاوہ دوسرے میدانوں میں تعمیر و ترقی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں　　ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

تعلیم اور اقتصادیات، جو بقیہ چیزوں کی اساس ہے، ان میں ہم کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اسی امکان کو ایک اور میدان میں تلاش کیا۔ یہ دعوت و تبلیغ کا میدان تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دعوت کی راہ سے ہم نہ صرف ملک کے طبقات میں اپنے لئے کام کے مواقع پا سکتے ہیں بلکہ حکمراں قوم کے اندر بھی ہمارے لئے جدوجہد کا میدان کھلا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ یہ کام خود اسلام کا اہم ترین مقصود ہے اور بالآخر اس غلبہ تک بھی پہنچانے والا ہے جہاں ہم سیاسی زور آزمائی کے ذریعہ ناکام طور پر پہنچنا چاہتے ہیں۔

یہ دونوں تحریکیں، اپنی ابتدائی شکل میں، نہایت مفید اور دور رس تحریکیں تھیں۔ مگر بدقسمتی سے وہ عام مسلمانوں کو اپنے ساتھ نہ لے سکیں۔ اس کی وجہ دو طرفہ تھی۔ ایک طرف ہمارے رہنماؤں کا ذہن سامراج دشمن خیالات سے اتنا زیادہ ماؤف ہو چکا تھا کہ کسی اور انداز سے سوچنا ان کے لئے ممکن نہ رہا تھا۔ ہر وہ شخص انھیں سامراج کا ایجنٹ

دکھائی دیتا تھا، جو سامراج سے سیاسی مقابلہ کی بات نہ کرے۔ اس کی آخری حد یہ ہے کہ علی گڑھ کے سابق استاد پروفیسر آرنلڈ کی قیمتی کتاب پریچنگ آف اسلام ہمارے رہنماؤں کو سامراجی اغراض کے تحت لکھی ہوئی کتاب نظر آئی۔ کیونکہ اس میں تلوار کے بجائے پرامن تبلیغ کو اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بتایا گیا تھا!

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ اس نظریہ کے دونوں علم بردار اس اہلیت کا ثبوت نہ دے سکے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی صحیح وکالت کر سکتے ہیں۔ سرسید احمد خاں نے اپنے موقف کی حمایت کے لئے یہ نادانی کی کہ قرآن کو انیسویں صدی کے مغربی افکار پر ڈھالنا شروع کر دیا۔ ان کے اخلاص کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ انھوں نے "تہذیب الاخلاق" کو اپنے ذاتی فکر کا نمائندہ قرار دے کر اس کو علی گڑھ کالج سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کی۔ مگر یہ تقسیم عملی طور پر ممکن نہ ہو سکی اور ایک صحیح کام کے لئے غلط استدلال نے ان کے مشن کو لوگوں کی نظر میں مشتبہ بنا دیا۔

اسی قسم کی غلطی دوسری شکل میں مرزا غلام احمد قادیانی نے کی۔ انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا تو یہ وہ وقت تھا جبکہ سارے مسلم رہنما انگریز کے خلاف جہاد حریت میں مصروف تھے۔ ان پرجوش مجاہدین کو محسوس ہوا کہ قادیانی مشن مسلمانوں کو مقدس جہاد کے محاذ سے ہٹا کر پرامن تبلیغ کے میدان میں لگا دینا چاہتا ہے۔ مرزا صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ جہاد (بمعنی سیاسی مقابلہ) کوئی مستقل شرعی حکم نہیں ہے۔ وہ صرف دفاعی ضرورت کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ مگر ہمارے مجاہدین حریت کے لئے یہ جواب تشفی بخش ثابت نہ ہو سکا اور انھوں نے فتویٰ دیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی انگریزوں کے ایجنٹ ہیں۔ اب مرزا صاحب نے ایک اور قدم بڑھایا۔ انھوں نے اپنی بات کو مستند ثابت کرنے کے لئے کہنا شروع کیا کہ ان پر وحی آتی ہے اور وہ جو کچھ بولتے ہیں خدا کی طرف سے بولتے ہیں۔ یہ دعویٰ اپنی تمام تر غلطی کے باوجود، قدیم زمانہ میں انوکھا نہ تھا کیونکہ ہمارے بہت سے بزرگ، مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ — ۱۷۶۲) بھی: الھمنی ربی (میرے رب نے مجھ کو الہام کیا) جیسی زبان میں کلام کرتے ہیں۔ تاہم مرزا صاحب کی غلطی میں مزید شناعت اس لئے پیدا ہو گئی کہ انھوں نے صاف لفظوں میں اپنے رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کر دیا جو، ختم نبوت کے بعد، اجماعی طور پر کفر کو مستلزم ہے۔

ان چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو فریقوں کے درمیان جو گفتگو "حالات کے لحاظ سے اسلامی عمل کی منصوبہ بندی" کے عنوان پر ہونی چاہئے تھی، وہ قرآن کی تفسیر جدید اور نبوت محمدی کے بعد دوسری نبوت جیسے مسائل پر مرکوز ہو گئی۔ آغاز میں اگر سرسید احمد خاں اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مخالفین غلطی پر تھے تو آخر میں سرسید اور مرزا قادیانی شدید تر غلطیوں کا شکار ہو گئے اور ملت کے حصہ میں کفر و فسق کے فتووں کے سوا اور کچھ نہ آیا

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام ۲۲ — ۲۵ جنوری ۱۹۷۷ کو ایک سیمینار ہوا۔ عنوان تھا:

"اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" ISLAM IN A CHANGING WORLD

یہ مقالہ اس موقع پر ۲۵ جنوری کی نشست میں پڑھا گیا۔

اخبار نیویارک (۳۱ مارچ ۱۹۵۱ء) میں ایک دلچسپ رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اس کے ایڈیٹر نے اطلاع دی تھی کہ اس کو بذریعہ ڈاک ایک مشین وصول ہوئی جس کا نام اس کے موجد نے READING EASE CALCULATOR رکھا ہے۔ اس مشین کی خاصیت یہ تھی کہ اس کو کسی بھی تحریری مواد پر استعمال کرکے اس تحریر کی کیفیت معلوم کی جا سکتی تھی۔ مشین کے موجد نے داخلی قدر و قیمت کے تمام پہلو حذف کر دیئے تھے۔ گویا ساٹرے بڑے مشاہرہ کے لٹریری ایڈیٹروں کی ضرورت کو بھی ختم سمجھ لیا گیا تھا۔ وہ سب کچھ جو اس مشین کو عمل میں لانے کے لیے کرنا تھا، وہ یہ کہ مخصوص ہدایات کے مطابق ایک چھوٹے سے ڈائل کو سٹ کیا جائے۔ پھر ایک انڈیکیٹر کو خاص طریقے سے گھمایا جائے اور اس کے بعد مشین کے فیصلہ کو پڑھا جائے جو چار میں سے کسی ایک شکل میں سامنے آتا تھا ــــ بہت سخت، سخت، آسان اور بہت آسان۔ ہدایات کا کتابچہ بتاتا تھا کہ اس کی بنیاد مواد کی خوبیوں پر تھی۔ یعنی سب سے آسان کا مطلب تھا سب سے عمدہ، اور سب سے سخت کا مطلب سب سے خراب۔ نیویارک کے ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ اس مشین کا سب سے پہلا استعمال اس نے اسی کتابچہ پر کیا جو مشین کے ساتھ مشین کے تعارف اور ترکیب استعمال کے لیے آیا تھا۔ مشین نے بتایا "بہت سخت" اور کم سے کم اس معاملے میں اس نے مشین کے فیصلہ کو قبول کر لیا۔

اس مثال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کا یہ رجحان کہ ہر چیز کو میکنکل بنایا جائے، کس قدر بے معنی ہے۔ انسان کو مشین فرض کرنے کے نتیجہ میں آج کے اہل علم کیسی کیسی نادانیاں کر رہے ہیں، اس کی ایک تازہ مثال یہ ہے کہ ایل یونیورسٹی اسکول آف میڈیسن (نیو ہیون) کے ڈاکٹر جوزڈیلگاڈو (JOSE M.R. DELGADO) نے اعلان کیا ہے کہ انھوں نے انسان کی مشینی تطہیر (MECHANICAL PURGING) کا ایک نیا طریقہ دریافت کر لیا ہے جس کو وہ ای۔ایس۔بی یعنی دماغ کی برقیاتی تحریک (ELECTRICAL STIMULATING OF BRAIN) کا نام دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طریقہ کو استعمال کرکے ایک زیادہ پرامن سماج بنایا جا سکتا ہے۔

ان کے اس یقین کی بنیاد ان کی وہ کامیابی ہے جو انھوں نے کمپوٹر کے ذریعہ چمپنیزی کے دماغ سے غیر حسیاتی ربط (NON-SENSORY CONNECTION) قائم کرنے میں حاصل کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ذی حیات کا دماغ جواب تک صرف اس کے اپنے حواس سے مربوط سمجھا جاتا تھا اب خارج میں پیدا کردہ ریڈیائی لہروں کے ذریعہ بھی اس سے ربط قائم کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ڈیلگاڈو نے ایک چمپنیزی کے دماغ کے جارحانہ مرکز سے ربط پیدا کیا اور اس کو اس حد تک متاثر کیا کہ اس کی جارحانہ طینت جاتی رہی۔ ان کے اس طریقہ کو "غیر حسیاتی تحریک بذریعہ کمپوٹر" کا نام دیا گیا ہے۔ بمبئی کے ایک اخبار (بھارت جیوتی ۱۵ ستمبر ۱۹۷۱ء) نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ تجربہ اپنے اندر بہت غیر معمولی متضمنات رکھتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ انسانی دماغ میں برقی تحریک پیدا کرکے بہتر انسان (BETTER MAN) اور بہتر سماج کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر ڈیلگاڈو کی دریافت کو انسان پر استعمال کرنے کی صورت کیا ہوگی۔ کیا انسان کے "ناپسندیدہ جذبات" کو دائمی طور پر ختم کر دیا جائیگا۔ یا ہر آدمی کے ساتھ ایک اور آدمی لگا دیا جائے گا جو ڈاکٹر ڈیلگاڈو کی مشین لیے ہوئے ہر وقت منتظر رہے گا کہ کب اس کے اندر

کوئی ناپسندیدہ جذبہ ابھرے اور فوراً مشین کو عمل میں لاکر اس کو ٹھنڈا کر دیا جائے۔ اگر پہلی صورت ہو تو وہ ناممکن ہے ایک ایسی دنیا جہاں ہر روز بے شمار لوگ پیدا ہوتے ہوں اور بے شمار لوگ مرجاتے ہوں، آخر کس طرح اس کو ممکن بنایا جائے گا کہ ساری انسانی آبادی کی مسلسل تطہیر ہوتی رہے۔ انسانیت کے موجودہ تمام وسائل بھی اس کو مسلسل جاری رکھنے کے لیے ناکافی ہیں اور اگر صرف کچھ "ناپسندیدہ" لوگوں کو اس مشین کا معمول بننے کے لیے چنا جائے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ نیا علم ان لوگوں کے ہاتھوں غلط استعمال کا شکار نہ ہوگا جو اس کام کے ذمہ دار بنائے جائیں گے ایک مصنف اس ایجاد کے نتائج پر شک کرتے ہوئے لکھتا ہے:

KNOWLEDGE AND MORAL RESPONSIBILITY ARE NOT NECESSARILY INTERLINKED

یعنی علم اور اخلاقی ذمہ داری لازمی طور پر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اگر علم اور اخلاقی ذمہ داری لازم و ملزوم ہوتے تو ایٹمی توانائی کی دریافت ایٹم بم کی صورت اختیار نہ کرتی۔

اگر اس دریافت کے معنی یہ ہوں کہ وقتی مواقع پر انھیں استعمال کیا جائے۔ یعنی جب کسی انسان کے اندر کوئی ناپسندیدہ جذبہ ابھرے اس وقت مشین اس کے دماغ سے لگا دی جائے تو یہ اور بھی زیادہ ناقابل فہم ہے۔ اس مقصد کے لیے ڈاکٹر ڈیلگاڈو کو موجودہ تین ارب نسل انسانی کے لیے مزید تین ارب انسان پیدا کرنے ہوں گے کیونکہ یہ کسی ایک کا نہیں بلکہ سارے ہی انسانوں کا مسئلہ ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہر آدمی کے ساتھ ایک اور آدمی موقع کے انتظار میں اس کے ساتھ لگا رہے۔ تاہم اس ناممکن کو ممکن بنا دینے کے بعد بھی اصل مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

"اصلاحی مشین" صرف ان انسانوں پر اپنا عمل دہرا سکتی ہے جو مقید چمپنیزی کی طرح اس کے بس میں ہوں اپنے سیاسی آقاؤں کو پھر بھی وہ اپنا معمول نہیں بنا سکتی

کیونکہ ڈاکٹر ڈیلگاڈو کا مشینی پہرہ دار صرف ان انسانوں پر اپنا عمل دہرا سکے گا جو محبوس چمپنیزی کی طرح اس کے بس میں ہوں۔ ہٹلر اور اسٹالن جیسے انسانوں کو پھر بھی وہ اپنی مشین کا معمول نہیں بنا سکتا۔

آخری بات یہ ہے کہ انسان کے اندر فطرت نے جو صلاحیتیں رکھی ہیں، ان میں سے کوئی بھی بذات خود غلط نہیں ہے۔ صرف اس کا بے موقع استعمال اسے غلط کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر غصہ اور جارحیت بذات خود کوئی مستقل صفت نہیں ہیں۔ یہ دراصل اس صفت کا ایک بے جا ظہور ہے۔ جو زیادہ بہتر طور پر شجاعت اور مردانگی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر بالفرض انسان کی ذہنی صلاحیتوں میں تبدیلی لانا ممکن ہو، جب بھی یہ فطرت کے توازن کو بدلنے کی قیمت پر ہوگا۔ آپ انسان کے اندر سے غصہ کا مادہ نکال دیں تو آپ صرف غصہ ہی کو اس کے اندر سے نہیں نکالیں گے بلکہ اسی کے ساتھ یقین، جوش، حوصلہ، عزم، اقدام، اصول پر جمنے کی خصوصیات کو بھی اس کے اندر سے کمزور کر دیں گے اس قسم کا مصنوعی انسان کسی کارخانے میں مشین کا ہینڈل گھمانے کا فرض شاید انجام دے سکے۔ مگر وہ زندگی کے پرشور معرکہ میں کوئی کارنامہ دکھانے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

اس کا اخبار وہاں بھی پہونچ رہا تھا جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکتا تھا

روسی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ کا ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اس کے اندر بہت بڑی نصیحت چھپی ہوئی ہے۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب روس میں اکتوبر ۱۹۱۷ء کا انقلاب نہیں آیا تھا روس میں بالشویکوں (کمیونسٹوں کا قدیم نام) کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لیے شہنشاہ روس (زار) نے بالشویک پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا تھا۔ اور تمام بڑے بڑے لیڈروں کے نام گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے تھے۔

کچھ لیڈر گرفتار ہوئے، کچھ بچ کر جنگلوں اور غاروں میں روپوش ہو گئے۔ انھیں روپوش ہونیوالوں میں بالشویک پارٹی کا عظیم لیڈر لینن بھی تھا۔ لینن نے جنگلوں اور غاروں کے ایک دور افتادہ علاقہ کو اپنا مسکن بنایا اور وہاں روپوش ہو کر اخبار نکالنا شروع کر دیا۔ یہ اخبار دستی پریس میں چھاپ کر دستی طور پر روس کے شہروں میں خفیہ طور پر پہنچا دیا جاتا تھا۔

ایک روز کا واقعہ ہے۔ ایک شخص ایک روسی شہر میں پنساری کے یہاں کچھ سامان خریدنے گیا جب وہ سامان خرید کر گھر لایا اور پڑیا کھولی تو اچانک اس کی نظر پڑیا والے کاغذ کے چھپے ہوئے الفاظ پر پڑی۔ یہ ایک اخبار کا پھٹا ہوا صفحہ تھا جس میں آتشیں الفاظ اور گرما گرم عنوان کے ساتھ ایک عبارت چھپی ہوئی تھی۔

ردی کے اس ٹکڑے پر چھپی ہوئی عبارت پڑھ کر اس آدمی کے اندر عجیب کیفیت پیدا ہوئی، وہ بار بار اس کو پڑھتا رہا اور اس سے اپنے دل کو گرماتا رہا یہاں تک کہ اسے خیال ہوا کہ معلوم کرے کہ اس عبارت کا مصنف کون ہے اور یہ کس اخبار کا ٹکڑا ہے جو پنساری کی معرفت اسے ملا ہے۔

وہ تلاش میں لگ گیا۔ جوئندہ یابندہ۔ بالآخر اسے معلوم ہوا کہ یہ ردی کا ٹکڑا لینن کے اس اخبار کا پھٹا ہوا صفحہ ہے جو وہ روپوش ہو کر نکال رہا ہے۔

اب اس کا اشتیاق اور بڑھا اور وہ تلاش کرتا ہوا اس غار میں پہنچ گیا جہاں چھپ کر لینن اخبار نکالا کرتا تھا۔ اس کے بعد سے آخر تک وہ لینن کا ساتھی بنا رہا۔ اس طرح کے کتنے لوگ ہیں جن کو لینن نے صرف اپنے اخبار سے فتح کیا۔

لینن، زار کی پولیس سے بچنے کے لیے غار کے اندر روپوش تھا مگر اپنے اخبار کی بدولت وہ ہر شہر میں پہنچا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ بازار میں پنساری کی دوکان بھی اس کے حق میں پروپیگنڈے کا مرکز بنی ہوئی تھی اس کا اخبار وہاں بھی پہنچ رہا تھا، جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکتا تھا۔

یہ ہے موجودہ زمانے میں پریس کی قوت۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ پچاس برس پہلے باشعور لوگوں نے اس سے جو کام لیا تھا ابھی تک ہم وہاں بھی نہیں پہنچے ہیں اور آج کی زندہ قومیں پریس سے جو کام لے رہی ہیں اس کی تو عام مسلمانوں کو خبر بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں دوسری قومیں ہم سے اتنا آگے ہیں کہ ہم ان کے پیچھے بھی نہیں۔ پیچھے ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم بھی کہیں ہیں۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم ان کی نسبت سے کہیں نہیں ہیں۔

بادشاہوں کی مجلسیں علماء کی فقہی اور کلامی بحثوں سے معمور رہتی تھیں، جبکہ ٹھیک اسی وقت اسلام کی دعوت و اشاعت کا میدان سونا پڑا ہوا تھا

مسلمان بادشاہوں کی بدولت ہندوستان میں علماء اور صوفیا کو قدم جمانے اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کا موقع ملا — ہر دور میں بکثرت علماء پیدا ہوتے رہے، سلاطین دہلی کے ابتدائی دور میں علماء زیادہ تر نیشاپور، صغان، غزنین، کاشان، بلخ، سجستان، خوارزم اور تبریز سے آئے، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے، اور یہ اپنے ساتھ حنفی فقہ لائے، حجاز سے آنے والے علماء کی تعداد کم رہی، اس لیے ہندوستانی فقہ میں عراقی اور ترکستانی اثرات زیادہ غالب رہے، اور یہی فقہ ہندوستان میں رائج رہی، جس کی باضابطہ تدوین فتاوی تاتارخانی اور فتاویٰ عالمگیری میں ہوئی۔

سلاطین دہلی کی حکومت میں سب سے زیادہ علماء، علاؤالدین خلجی کے دور میں تھے ان کا اتنا شاندار اجتماع ہوگیا تھا کہ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ اس وقت کی اسلامی دنیا یعنی بخارا، سمرقند، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، صفاہان، رے اور روم میں یہاں کے جیسے علماء نہیں پائے جاتے تھے جملہ علوم میں کامل دستگاہ رکھنے والے علماء یہاں موجود تھے، مولانا ضیاء الدین برنی ان پر فخر کرتے ہوئے یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ بعض علماء تو امام غزالی اور امام رازی کے ٹکر کے تھے، اور فقہ کے بعض ماہرین کو امام ابو یوسف اور امام محمد کا مرتبہ حاصل تھا، خود امیر خسرو کو دہلی پر فخر تھا، انھوں نے اس کو قبۂ اسلام کہہ کر یاد کیا ہے، محمد تغلق کے زمانے میں علماء کی تعداد اور بھی بڑھ گئی تھی، قلقشندی کا بیان ہے کہ دو سو فقہا سلطان کے دسترخوان پر موجود ہوتے تھے اور وہ ان

زندگی ایک بازار ہے۔ یہاں کوئی چیز اسی وقت ایک شخص کو ملتی ہے جب کہ اس کی قیمت ادا کرنے کے لیۓ اس کی جیب میں پیسے موجود ہوں۔ آپ کسی سے کچھ لینا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے یہ جانئے کہ آپ اس کو کیا چیز دے سکتے ہیں آپ کا دینے کی پوزیشن میں ہونا ہی آپ کے لیۓ پانے کا استحقاق پیدا کرتا ہے، نہ کہ شکایت اور مطالبہ۔

سے مذہبی مذاکرے کیا کرتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق فقہا سے اس قدر متاثر تھا کہ اس نے فتاوائے فیروز شاہی کے نام سے فقہ کی تدوین کرائی جو زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔ سکندر لودی کی خواب گاہ میں روزانہ رات کو ستر علماء جمع ہوا کرتے تھے اور وہ ان سے فقہی مسائل دریافت کیا کرتا تھا۔

عہد مغلیہ میں بھی علماء کی تعداد زیادہ تھی، مُلاّ عبدالقادر بدایونی نے اپنے عہد کے جن ممتاز علماء کے حالات لکھے ہیں ان کی تعداد ۶۹ ہے، اسی طرح مآثر رحیمی کے مؤلف نے ایسے ۳۲ علماء کا ذکر کیا ہے جو عبدالرحیم خانخاناں کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ عہد عالمگیر میں جو علماء اس کے دربار میں مختلف خدمات پر مامور تھے ان کی تعداد ۴۲ ہے۔ عالمگیر کے زمانہ سے مولانا شاہ عبدالرحیم کے خاندان سے جو سلسلتہ الذہب چلا اس پر مسلمانوں کو آج بھی فخر ہے۔ ان علماء کے ناموں پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی شیراز، کاشان، تبریز، گیلان، مشہد اور ترکستان سے کچھ علماء ضرور آتے رہے، لیکن ان کے مقابلے میں ہندوستانی علماء کی تعداد زیادہ رہی، اور حنفی فقہ کی ترویج اور اس کی باضابطہ تدوین فتاوائے عالمگیری کی شکل میں ہوئی جس کو عالمگیر کا ایک عظیم الشان علمی و فقہی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ حنفی فقہ سے شافعی، مالکی، حنبلی اور شیعی فقہ کا تصادم ضرور ہوا۔ لیکن اکثریت حنفی فقہ کے ماننے والوں ہی کی رہی، اور یہ مغلوں کی بادشاہت کا دلچسپ پہلو ہے کہ وزارت کے عہدہ پر زیادہ تر شیعہ امراء مامور رہے۔ محل ایک عرصہ دراز تک راجپوت شہزادیوں کے زیر نگیں رہا لیکن سلطنت پر حنفی فقہ کا غلبہ رہا۔ (ماخوذ)

ناکامی کا سوال نہیں

جو حرکت کرنا چاہے اس کا راستہ کبھی بند نہیں ہوتا — گیس نیچے نہیں سماتی تو اوپر اٹھ کر اپنے لیے جگہ حاصل کر لیتی ہے۔ پانی کو اونچائی آگے بڑھنے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف بہہ کر اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ درخت سطح پر قائم نہیں ہو سکتا تو وہ زمین کو پھاڑ کر اس سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کرتا ہے۔

یہی طریقہ آپ کو بھی اختیار کرنا ہے، آپ کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو سمجھیں، اپنی قوتوں کو صحیح ڈھنگ سے ترتیب دیں اور پھر ماحول کو سمجھ کر ماحول کے اندر اس طرح گھسیں کہ اسکے مقابلہ میں اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لئے آپ پوری طرح مسلح ہوں۔ حالات سے اپنی اہمیت منوانے کے لئے آپ نے ضروری سامان کر لیا ہو۔

لیاقت پیدا کیجئے اور دانش مندی کے ساتھ اپنے لئے راہ نکالئے، اس کے بعد آپ کو کبھی ماحول سے شکایت نہ ہوگی۔ زندگی کی کسی منزل پر آپ اپنے کو ناکام محسوس نہیں کریں گے۔ ناکامی اور مایوسی صرف وہیں آتی ہے جہاں زندگی کی ضروری شرطیں پوری کرنے میں کوئی کوتاہی رہ گئی ہو۔

وہ جانتے تھے کہ انھیں اپنا حصّہ کس طرح ادا کرنا ہے

حویطب بن عبدالعزی، فتح مکہ کے بعد، بیعت کرنے کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے اپنے قدیم ساتھی ابوذر غفاریؓ سے پوچھا، آپ کو سلام کس طرح کیا جاتا ہے۔ (کیف یقال اذا سُلّم علیہ) انھوں نے کہا، جب تم آپ کے پاس حاضر ہو تو اس طرح کہو ـــ السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ وبرکاتہ۔ یہ پیغمبر کا کام نہیں کہ وہ ہر ایک سے یہ بتائے کہ وہ کس طرح اس کو مخاطب کریں، یہ وہ کام ہے جو آپ کے ساتھیوں کو خود سے جاننا چاہئے۔

اہل نجران کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب ملا تو انھوں نے غور و فکر کے بعد آپ کے پاس اپنا وفد بھیجا تاکہ وہ آپ سے صلح کی دفعات طے کرے۔ وہ مدینہ پہنچے تو انھوں نے اپنا سادہ سفری لباس تبدیل کیا اور ریشمی کپڑے اور سونے کی انگوٹھیاں پہن کر آپ سے ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے سلام کیا تو آپ نے ان کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ وہ دیر تک آپ کے پاس بیٹھے رہے مگر آپ نے ان سے کوئی کلام نہ کیا۔ اس کے بعد وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف سے ملے جن سے ان کی پہلے سے ملاقات تھی۔ ان لوگوں نے معاملہ کو سنا تو حضرت علیؓ کو بلا کر مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ لوگ اپنے مزیّن کپڑے اور سنہری انگوٹھیوں کو اتار دیں اور اپنے سفری لباس پہن کر آپ کے پاس جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اب آپ نے سلام کا جواب دیا اور ان سے بات چیت کی اور فرمایا:

والذی بعثنی بالحق لقد اتونی المرۃ الاولی وان ابلیس معہم

اس خدا کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، جب وہ پہلی مرتبہ میرے پاس آئے تو ان کے ساتھ شیطان تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ لباس فاخرہ کے ساتھ آپ کے پاس آئے تو آپ نے محسوس کیا کہ یہ چیزیں ان کے اندر احساس برتری پیدا کریں گی۔ ان کی متکبرانہ نفسیات کسی نتیجہ خیز گفتگو میں مانع ہوگی۔ مگر یہ بات آپ خود اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ حضرت علیؓ نے اس حقیقت کو جانا اور اپنا کردار ادا کیا۔

سعدؓ بن معاذ انصاری مدینہ کے ممتاز ترین شخصیت رکھنے والے آدمی تھے (کان من اعظم الناس واطولہم) امام احمد نے حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ خندق میں وہ زخمی ہوئے۔ ابن العرقہ قریشی نے تیر مارا جس سے ان کی رگ اکحل کٹ گئی۔ اس وقت ان کی زبان سے دعا نکلی:

اللّٰہم لاتمتنی حتی تقرعینی من بنی قریظۃ

خدایا مجھے موت نہ دے جب تک بنی قریظہ سے میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔

بنو قریظہ ایک یہودی قبیلہ تھا جو مدینہ کے اندر آباد تھا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف مستقل سازشوں میں مشغول رہتا تھا۔ غزوۂ خندق میں انھوں نے کھل کر قریش کا ساتھ دیا۔ یہ صریح طور پر ایک غداری کا فعل تھا۔ چنانچہ غزوۂ خندق سے فارغ ہوتے ہی آپ نے ان کے قلعہ کو گھیر لیا۔ ۲۵ دن کے محاصرہ کے بعد انھوں نے کہا کہ سعد بن معاذ جو

فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔ سعدؓ بن معاذ اسلام سے قبل ان کے حلیف تھے۔ وہ زخمی حالت میں خچر پر سوار کر کے لائے گئے۔ سعدؓ بن معاذ نے تورات کے مطابق فیصلہ کیا کہ ان کے قابل جنگ مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ ان کی اولاد کو گرفتار کر لیا جائے اور ان کے اموال کو ضبط کر لیا جائے۔

اس کے بعد انھوں نے دعا کی:

اللّٰھم ان کنت ابقیت علیٰ نبیك من حرب قریش شیئًا فابقنی لھا وان کنت قطعت الحرب بینه و بینھم فاقبضنی الیك

خدایا! اپنے نبی کے ساتھ قریش کی جنگ میں اگر تو نے کوئی حصہ باقی رکھا ہو تو مجھے اس کے لئے باقی رکھ۔ اور اگر تو نے ان کے درمیان جنگ کو ختم کر دیا ہو تو مجھے اپنے پاس بلا لے۔

اس دعا کا پس منظر یہ تھا کہ سعدؓ بن معاذ اپنی شخصیت، اپنی تاریخ اور یہود سے اپنے تعلق کی بنا پر مدینہ کے واحد شخص تھے جو ان کے اوپر اس قسم کے فیصلے کے لئے موزوں ہو سکتے تھے، انھوں نے سوچا کہ میں آپ کے اس کام کو انجام دے لوں اس کے بعد اس دنیا سے جاؤں۔ میرے بعد کوئی دوسرا موزوں شخص اس کام کے لئے نہ ہوگا ——

کس قدر باشعور تھے رسول اللہؐ کے یہ اصحاب!

آدمی اسی چیز کو کھو دیتا ہے جس کو وہ پانا چاہتا ہے

ابن عبد البر نے استیعاب میں قتادہ کی روایت نقل کی ہے۔ عمر فاروقؓ کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کو ایک بوڑھی خاتون ملیں۔ آپ نے ان کو سلام کیا۔ سلام کا جواب دینے کے بعد وہ بولیں:

"اے عمرؓ، ایک وقت تھا جب میں نے تم کو بازار عکاظ میں دیکھا تھا۔ اس وقت تم عمیر کہے جاتے تھے۔ لاٹھی ہاتھ میں لئے بکریاں چراتے پھرتے تھے۔ پھر زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ تم عمرؓ کہے جانے لگے۔ پھر ایک وقت آیا کہ تم امیر المومنین کہے جاتے ہو۔ دیکھو رعیت کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرتا ہے، اس کے لئے دور کا آدمی بھی قریبی رشتہ داروں کی طرح ہوتا ہے اور جو موت سے ڈرتا ہے، اس کے حق میں اندیشہ ہے کہ وہ اسی چیز کو کھو دے گا جسے وہ بچانا چاہتا ہے۔"

جارود عبدی، جو اس وقت عمر فاروقؓ کے ساتھ تھے، یہ سن کر بولے: "اے عورت تو نے امیر المومنین کے ساتھ بہت زبان درازی کی، عمر فاروقؓ نے فرمایا: انھیں کہنے دو، جانتے ہو یہ کون ہیں۔ ان کی بات تو سات آسمانوں کے اوپر سنی گئی تھی۔ عمر کو تو بدرجہ اولیٰ سننا چاہئے۔"

یہ خاتون قبیلہ خزرج کی خولہ بنت ثعلبہ تھیں جن کا ذکر قرآن کی سورہ نمبر ۵۸ کے شروع میں آیا ہے:

"بے شک اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے بارہ میں ۔۔۔"

ان کے پاس اپنی ہر غیر خدا پرستانہ روش کے لئے خدا کی کتاب میں دلیل موجود تھی !

مسیح کے ظہور سے پہلے یہودی حضرت مسیح کے منتظر تھے۔ وہ دعا کرتے تھے کہ "خدایا! مسیح کو جلد بھیج"۔ مگر جب مسیح ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے تو انھوں نے ان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ اپنے خیال سے آپ کو دار پر چڑھا دیا۔ اور آپ کا نام بیل زبوب (شیطان) رکھا۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ وہی "شک" تھا جو مصریوں کو حضرت یوسفؑ کی نبوت ماننے میں رکاوٹ بنا تھا۔ حضرت مسیح اپنے ساتھ دنیوی شان و شوکت لے کر ظاہر نہیں ہوئے عام انسانوں کی طرح وہ بھی ایک انسان تھے۔ یہودیوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ انھیں جیسا ایک انسان وہ عظیم انسان ہو سکتا ہے جس کی پیشین گوئی ان کی مقدس کتابوں میں کی گئی تھی۔

یہودیوں نے حضرت مسیح کے انکار کا ایک نہایت آسان راستہ نکالا۔ ان کی کتابوں میں بعد کے دور کے لئے دو پیغمبروں کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ ایک مسیح، دوسرے "وہ نبی"۔ انھوں نے یہ کیا کہ حضرت مسیح کو اُس معیار سے جانچنا شروع کیا جو "وہ نبی" کے لئے بتایا گیا تھا۔ چونکہ یہ معیار حضرت مسیح پر راست نہیں آسکتا تھا۔ انھوں نے اعلان کر دیا کہ یہ "جھوٹے مسیح" ہیں۔ اگر وہ سچے مسیح ہوتے تو ضرور ہماری آسمانی کتابوں کی پیشین گوئیاں ان پر صادق آتیں۔

انھوں نے کہا کہ مسیح کا ظہور، تورات کی نص کے مطابق بعض نشانیوں کے ساتھ ہوگا۔ اور جب تک یہ نشانیاں ظاہر نہ ہوں، جو کوئی بھی مسیح ہونے کا دعوے دار ہوگا، وہ جھوٹا ہوگا۔ ان نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ مسیح ایک غیر معروف مقام سے ظاہر ہوگا۔ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ اس آدمی کا گھر ناصرہ میں ہے اور ناصرہ فلسطین کا ایک مشہور معروف شہر ہے۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ وہ ایک لوہے کے عصا کے ساتھ حکومت کرے گا۔ یعنی وہ تلوار سے کام لے گا۔ مگر اس مدعی مسیح کے پاس لکڑی کا ڈنڈا تک نہیں ہے۔ تیسری شرط یا نشانی یہ ہے کہ وہ داؤد کے تخت پر بیٹھ کر داؤد کی بادشاہت کو قائم کرے گا۔ جبکہ اس مسیح کا حال یہ ہے کہ اس کے پاس بیٹھنے کے لئے ایک چٹائی بھی نہیں ہے۔ اسی طرح ایک شرط یہ ہے کہ وہ تورات کی شریعت کو پھر سے قائم کرے گا۔ مگر اس شخص نے اس شریعت کو منسوخ کر دیا۔ ایک نشانی مسیح کی یہ ہے کہ اس کے عہد میں عدل و انصاف اس قدر ترقی پائے گا کہ نیکی اور ہمدردی انسان تو

مفتی محمد عبدہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار وہ کھانے کی ایک مجلس میں تھے۔ ان کے ساتھ اس دعوت میں اور بھی بڑے بڑے علماء تھے۔ مفتی محمد عبدہ نے چمچہ سے کوئی چیز اٹھا کر منہ میں ڈالی تو ازہر کے ایک عالم نے متعجب ہو کر کہا:

احلال ھٰذا ام حرام (یہ حرام ہے یا حلال)

الاہرام ۲۳ اپریل ۱۹۴۵

انسان حیوانوں میں بھی پائی جائے گی۔ جب کہ مسیح کے زمانہ میں یہ حال ہے کہ ہر طرف ظلم اور ناانصافی کا دور دورہ ہے اسی طرح ایک نشانی یہ ہے کہ مسیح کے وقت خدا پرست اتنے کامیاب ہوں گے کہ تمام دنیا کی قوموں پر فتح پائیں گے۔ مگر ہم نہایت ذلت اور غلامی کی حالت میں رومیوں کے ماتحت ہیں، پھر یہ شخص وہ مسیح کیسے ہو سکتا ہے جس کی تورات میں پیشین گوئی ہے۔

یہ جتنے معیار یہودیوں نے پیش کئے، وہ سب تورات میں لکھے ہوئے ہیں مگر وہ "وہ نبی" کے ہیں نہ کہ مسیح کے۔ یہودیوں نے "وہ نبی" کے معیار کو مسیح کے انکار کے لئے استعمال کیا۔ مگر جب "وہ نبی" عرب کے ایک غیر معروف شہر میں "محمد بن عبد اللہ" کی صورت میں پیدا ہوئے اور خدا نے آپ پر وہ تمام نشانیاں مکمل طور پر پوری کر دیں جو تورات میں لکھی ہوئی تھیں تو انھوں نے آپ کی نبوت کا انکار کرنے کے لئے ایک اور وجہ تلاش کر لی۔ انھوں نے کہا: "اب تک تمام انبیاء اسرائیل کے خاندان میں آئے، پھر اسمٰعیل کے خاندان میں کیسے کوئی نبی پیدا ہو سکتا ہے"

یہود نے حضرت مسیح کے انکار کے لئے یہ کیا کہ پیغمبر آخر الزماں کی علامتوں کو آپ پر چسپاں کیا جو ظاہر ہے کہ آنجناب پر چسپاں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس کے بعد جب پیغمبر آخر الزماں کا ظہور ہوا تو آپ کو ان علامتوں سے جانچا جو ان کی کتاب میں حضرت مسیحؑ کے لئے بتائی گئی تھیں۔ اس طرح انھوں نے دونوں نبیوں کا انکار کر دیا۔ اور دونوں مواقع پر ان کے پاس یہ کہنے کے لئے کافی الفاظ موجود تھے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں کتاب اللہ کی روشنی میں کر رہے ہیں۔ ہم نے خدا کی کتاب سے ہٹ کر اپنے لئے کوئی موقف اختیار نہیں کیا ہے!

الرسالہ اپریل ۱۹۷۷

"دیکھو ترکیب استعمال سمجھ لو"۔ حکیم صاحب نے مریض کو نسخہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ارشاد ہو"

"اس کو گرم پانی میں اچھی طرح جوش دے کر، چھان کر سوتے وقت پی لینا۔ اللہ نے چاہا تو پہلی ہی خوراک میں آرام محسوس ہوگا۔"

"بہت اچھا حضور"

"اور دیکھو کل صبح آکر اطلاع دینا"

"بہت اچھا"

دوسری صبح مریض پھر آیا، حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور پوچھا، کہو کچھ فرق محسوس ہوا۔ مریض نے کہا "نہیں حضور کچھ فرق نہیں بلکہ آج تو تکلیف اور بڑھ گئی ہے"۔ حکیم صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے، ماتھے پر ہاتھ رکھا، لمبی سانس لی اور کچھ یاس آمیز لہجہ میں کہا اچھا لاؤ نسخہ دکھاؤ۔

"نسخہ؟" مریض بولا "حضور نسخہ تو آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے جوش دے کر پی لیا"

حکیم صاحب نے گھبرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں "کیا کہا! نسخہ پی لیا"

"جی حضور نسخہ جوش دے کر پی لیا جیسا کہ آپ نے بتایا تھا کہ اس کو ...."

"ارے بدبخت"، حکیم صاحب غصہ سے بولے "کہیں نسخہ بھی جوش دے کر پیا جاتا ہے، نسخہ میں جو دوا لکھی جاتی ہے وہ استعمال کی جاتی ہے نہ کہ نسخہ کا کاغذ"

قارون ایک اسرائیلی خاندان میں پیدا ہوا۔ مگر وہ قبطی بادشاہوں کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ کیونکہ دنیوی کامیابی کی کنجیاں اس وقت قبطی حکمرانوں ہی کے پاس تھیں۔

قارون ایک اسرائیلی مسلمان تھا۔ مگر قرآن میں اس کا ذکر فرعون اور ہامان کے ساتھ کیا گیا ہے (عنکبوت)۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بنی اسرائیل سے کٹ کر وقت کے ظالم حکمراں فرعون سے جا ملا تھا۔

قارون کو بائبل اور تالمود میں قورح کہا گیا ہے۔ بائبل کی روایت (خروج ۶: ۲۱-۱۸) کے مطابق وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا، حضرت موسیٰ اور قارون کے والد ایک دوسرے کے سگے بھائی تھے۔ قارون بنی اسرائیل میں پیدا ہوا اور اس وقت کے لحاظ سے وہ مسلمان تھا۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی شخصیت اور زبردست صلاحیتیں عطا کی تھیں۔

اس طرح کے لوگوں میں اکثر نہایت خاموشی سے یہ کمزوری داخل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کی قیمت اسی موجودہ دنیا میں وصول کر لینا چاہتے ہیں۔ قارون میں بھی یہی کمزوری گھس آئی۔ وہ دن بدن اسرائیل سے دور اور فرعون سے قریب ہونے لگا۔ کیونکہ دنیوی کامیابیوں کی کنجیاں اس وقت فرعون کے پاس تھیں۔ اس کی اس پالیسی نے اس کے لئے دولت اور عزت کے دروازے کھول دیئے، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اقتدار پرستی اور مصلحت پسندی کی انتہا پر پہنچ گیا۔ فرعون کے وزیر اعظم ہامان کے بعد وہ قبطی شہنشاہیت کا تیسرا سب سے بڑا رکن تھا۔ وہ بطور خود اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ یہ مرتبہ مجھے اپنی خصوصی صلاحیتوں (قصص - ۷۸) کی بنا پر ملا ہے۔ حالانکہ دراصل یہ قومی غداری کی قیمت تھی۔ فرعون بنی اسرائیل کو مصر سے مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بنی اسرائیل کا ہم قوم ہو۔ تاکہ جب وہ بنی اسرائیل کو مٹانے کے منصوبے زیر عمل لائے تو اس کے پاس یہ کہنے کا جواز ہو کہ یہ سب ہم ملک کی فلاح کے لئے کر رہے ہیں۔ اگر ہم کو بنی اسرائیل سے قومی یا نسلی دشمنی ہوتی تو ہم انھیں کے ایک فرد کو اپنے دربار میں اتنا اونچا مقام کیوں دیتے۔ اس کو جو مرتبہ ملا وہ بنی اسرائیل کی بربادی کی قیمت پر تھا نہ کہ اپنی کسی صلاحیت کی بنا پر۔

قارون کے بارہ میں قرآن کا بیان حسب ذیل ہے:

"قارون، موسیٰ کی قوم میں سے تھا، پھر اس نے اپنی قوم سے بغاوت کی۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ جب اس کی قوم (بنی اسرائیل) کے لوگوں نے اس سے کہا: اپنی اس حیثیت پر نہ اترا، اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں اپنے حصہ کو بھول نہ جا اور احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر۔ اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔ تو اس نے جواب دیا: یہ سب کچھ جو مجھے ملا ہے اپنے اس علم کی بنا پر ملا ہے جو مجھے حاصل ہے۔

کیا قارون کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت وجمعیت والے تھے۔ اور مجرموں سے ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔ ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ کے ساتھ نکلا۔ جو لوگ دنیوی زندگی کے طالب تھے، وہ اس کو دیکھ کر کہنے لگے: کاش ہم کو بھی وہ ساز وسامان ملا ہوتا جو قارون کو ملا ہے۔ واقعی وہ بڑا نصیب والا ہے۔ جن لوگوں کو حقیقت کا علم عطا ہوا تھا، انھوں نے کہا: تمھارا ناس ہو، خدا کے گھر کا ثواب اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ جو ایسے شخص کو ملتا ہے جو خدا پر یقین کرے اور اچھے کام کرے، اور وہ انھیں کو ملتا ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔ پھر ہم نے قارون اور اس کی محل سرا کو زمین میں دھنسا دیا۔ سو کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ کی پکڑ سے بچا لیتی، اور نہ وہ خود اپنے کو بچا سکا۔ اور جو لوگ اس کے جیسے ہونے کی تمنا کرتے تھے، اس کا انجام دیکھ کر کہنے لگے، اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے۔ اگر ہم پر اللہ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسا دیتا، منکروں کو کبھی فلاح نہیں ہوتی۔"

قصص ۸۲ - ۷۶

ہر آدمی کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے۔

ابو تمام (۲۳۱ - ۱۸۸ھ) دمشق کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہ ایک غریب آدمی تھا اور قاہرہ کی مسجد عمرو بن عاص میں پانی بھرتا تھا۔ اپنے زمانہ کے مطابق شاعری میں طبع آزمائی کرنے لگا، یہاں تک کہ شاعر بن گیا۔ اس کے اشعار کا دیوان چھپ چکا ہے اس کے علاوہ اس کی دو تصانیف الحماسہ اور فحول الشعرار ہیں جن میں اس نے زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام کے شاعروں کے کلام کا انتخاب درج کیا ہے۔ یہ انتخاب اتنا عمدہ ہے کہ جب وہ سامنے آیا تو لوگ کہنے لگے: "اس کا انتخاب اس کی اپنی شاعری سے بہتر ہے۔"

الحماسہ کی شکل میں جو انتخاب ہے، وہ اس نے محض اتفاقاً کیا تھا۔ ایک شخص کے یہاں ایک بار اس کو قیام کرنا پڑا۔ وہاں مختلف شعرار کے کلام کا ذخیرہ موجود تھا۔ کوئی دوسرا مشغلہ نہ ہونے کی وجہ سے اس نے انتخاب شروع کر دیا۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام میں اپنی عمر صرف کر دیتا ہے۔ حالانکہ اس کی زیادہ قیمت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس کوئی دوسرا کام اس سے محض ضمنی طور پر ہو جاتا ہے اور وہ زیادہ قیمتی قرار پاتا ہے۔

اکثر اوقات آدمی کے لئے بہترین بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے طبع زاد کام کا کریڈٹ لینے کا شوق نہ کرے۔ بلکہ کسی دوسرے کے کام میں شریک ومعاون بن جائے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت پسندی پر اپنے کو راضی کر سکیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عوامی بھیڑ میں سچائی دب کر رہ جاتی ہے

حضرت مسیح کو اللہ نے بہت سے معجزے دیئے تھے۔ وہ مٹی کے پرندہ پر پھونک مارتے اور وہ سچ مچ پرندہ بن کر اڑنے لگتا۔ وہ اندھے اور کوڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور وہ فوراً اچھے ہوجاتے اور دیکھنے لگتے، وہ مرے ہوئے انسان سے کہتے کہ اٹھ، اور وہ دوبارہ زندہ ہوکر کھڑا ہوجاتا۔ وہ بتادیتے کہ کس کے پیٹ میں کیا ہے اور کس کے گھر میں کن چیزوں کا ذخیرہ ہے (آل عمران۔ ۴۹)

یہ حیران کن باتیں آپ کے فرستادہ الٰہی ہونے کا ثبوت تھیں مگر یہود نے ان کو آپ کے انکار کا بہانہ بنالیا۔ انھوں نے کہا: یہ کوئی معلم دین یا قانون ساز نہیں، بلکہ شعبدہ باز ہے وہ گلیل کے سادہ مزاج باشندوں میں اس نے شہرت و مقبولیت حاصل کرلی ہے"، تاہم فلسطین کے مشرک رومیوں کا تاثر دوسرا تھا، مشرک قوموں کا عام مزاج یہ رہا ہے کہ جس کے اندر کوئی غیر معمولی بات دیکھتی ہیں، اس کو خدا سمجھ لیتی ہیں۔ برنا با حواری کی انجیل میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیح کے معجزوں کو دیکھ کر اس زمانہ کے مشرک رومی سپاہیوں نے آپ کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کردیا تھا۔

حضرت مسیح کے بعد جب سینٹ پال آپ کے مذہب میں داخل ہوا تو اس کو مسیحیت کے پھیلانے کے لیے سب سے آسان نسخہ یہ سمجھ میں آیا کہ عوامی ذہن کی رعایت سے مسیحیت کی ایک ایسی تعبیر پیش کی جائے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔ حضرت مسیح کی تعلیم کے مطابق آپ کے ابتدائی پیرو موسوی شریعت پر عمل کرتے تھے۔ سنیٹ پال نے اعلان کردیا کہ ایک عیسائی، شریعت یہود کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس زمانہ کے رومیوں اور یونانیوں کے مذہب متھرا پرستی (MITHRAISM) کے عقائد کو صرف الفاظ بدل کر مسیحیت میں داخل کرلیا اور کہا کہ مسیح خدا کے بیٹے تھے اور صلیب پر جان دے کر وہ اولاد آدم کے پیدائشی گناہ کا کفارہ ہوگئے ہیں، اب صرف ان پر ایمان لانا ہی نجات کے لئے کافی ہے۔

حضرت مسیح کے ابتدائی پیروؤں نے سنیٹ پال کی اس خودساختہ مسیحیت کی سخت مخالفت کی، مگر سنیٹ پال نے اپنی گھڑی ہوئی مسیحیت میں اس وقت کے عوام کے لیے جو اعتقادی کشش اور سہولت رکھ دی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ کثرت سے مسیحی دین میں داخل ہونے لگے حتی کہ جدید مسیحیوں کا ایک سیلاب امنڈ پڑا۔ اس عوامی ریلے میں سچے مسیحی جو تعداد میں بہت کم تھے۔ دب کر رہ گئے تاہم تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ تک بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو حضرت مسیح کو بندہ اور رسول مانتے تھے اور آپ کی الوہیت کے عقیدہ کو غلط قرار دیتے تھے مگر چوتھی صدی کے آغاز میں جب مشرقی رومی شہنشاہ قسطنطین (۲۷۲-۳۳۷) بعض سیاسی محرکات کے تحت عیسائی بن گیا تو سنیٹ پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کو سیاسی اقتدار کی سرپرستی بھی حاصل ہوگئی ۳۲۵ء میں نیقیہ (NICAEA) کی کونسل میں ۳۱۸ مسیحی نمائندے جمع کئے گئے تاکہ مسیحیت کا سرکاری عقیدہ متعین کریں۔ اس میں ۳۱۲ نمائندوں نے سرکاری تشریح کی حمایت کی بقیہ اس کے خلاف رہے

پادری ایرے ریس (ARIUS) اس کو چیلنج کرنے کیلئے اٹھا تو قسطنطین نے یہ کہہ کر اس کو خاموش کر دیا کہ "اگر تم اس کو نہیں مانتے تو دوسری چیز ہمارے پاس تلوار ہے۔"
"قسطنطین کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد ساری رومی سلطنت میں مسیحی مذہب پھیل گیا"۔ یہ تمام مسیحی اسی نئے مسیحی مذہب پر ایمان لائے تھے جو اولاً سینٹ پال اور اس کے بعد ترتولین (۲۳۰-۱۵۰) وغیرہ نے وضع کیا تھا۔ اس عوامی طوفان میں سچے مسیحیوں کے لیے زندہ رہنے کی کوئی شکل نہ تھی۔ اولاً خاموش اور اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ختم ہو گئے۔

اسلام کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ خود اللہ نے قرآن کو محفوظ رکھنے کا ذمہ لیا ہے۔ (جبکہ پچھلی آسمانی کتابوں کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری ان کے حاملین کے اوپر تھی) اسلام کے لیئے یہ خطرہ نہیں کہ وہ کبھی بدل کر کچھ سے کچھ ہو جائے یا مٹ کر ختم ہو جائے۔ مگر حفاظت کا یہ وعدہ متن اسلام کے لیئے ہے، گروہِ اسلام کے لئے نہیں ہے یہ بالکل ممکن ہے کہ اسلام پر بھی ایسا زمانہ آئے کہ کتابی حیثیت سے تو متن اسلام (قرآن) مکمل طور پر محفوظ ہو مگر عملاً ایسا ہو کہ آسمانی مذہب کے بجائے "بزرگوں کا مذہب" اس طرح رائج ہو جائے کہ عملاً وہی قرآن کی جگہ لے لے۔ جیسا کہ دوسری قوموں میں ہوا ہے۔ قرآن کی تلاوت تو خوب ہو رہی ہو مگر دین کو بزرگوں سے لیا جانے لگے حتی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام کی یہ خود ساختہ شکل عوام میں اس قدر مقبول ہو کہ اسلام کے سچے پیرو اس کے طوفان میں دب کر رہ جائیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ غلط ہے، بہت سے لوگ اس لیئے اس کے ساتھ لگ جائیں کہ عوامی پھیلاؤ کی وجہ سے دنیوی فائدے اس سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ علماً اس کے خلاف بولنے سے اس لیئے ڈریں کہ ان کے مدرسوں کے چندے بند ہو جائیں گے۔ قائدین اس لیئے اس سے قطع تعلق نہ کریں کہ انھیں اندیشہ ہو کہ ان کے استقبال کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ بہت سے کتاب اللہ کا علم رکھنے والے اس کو کتاب اللہ کے موافق نہ پائیں مگر اس لیے اس کے گروہ میں شامل رہیں کہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر اس کے پھیلے ہوئے حلقہ سے وہ بہت سے مفادات حاصل کر سکتے ہیں۔

عوامی مقبولیت کبھی سچائی کی سند نہیں رہی ہے۔ بلکہ کسی تحریک کا زیادہ پھیلاؤ اکثر یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ اس کے اندر کوئی غلطی تو شامل نہیں، کیونکہ حق کو ماننے والے ہمیشہ کم ہوتے ہیں اور اس کو پانے والے اور بھی کم۔ *

"ورقہ بن نوفل نے پیغمبر اسلام سے کہا تھا: 'کاش کہ اس زمانہ میں جب لوگ آپ کو قبیلہ سے نکال دیں گے میں زندہ رہوں'۔ یہ الفاظ ورقہ نے پیغمبر اسلام سے ۶۱۰ء میں کہے تھے اس کی پیشنگوئی ۶۱۶ء میں سامنے آگئی"۔

اوپر کا فقرہ کونستان ورژیل جارج کی کتاب "پیغمبر اسلام" سے ماخوذ ہے۔ تمام پیغمبروں میں یہ صرف پیغمبر اسلام کی خصوصیت ہے کہ آپ کی زندگی کے ہر واقعہ کو سن اور تاریخ کی زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی زندگی تاریخ کا ایک صفحہ ہے نہ کہ محض روایاتی کہانیوں کا مجموعہ۔

یہ ۳۱ جنوری ۱۹۷۶ کا واقعہ ہے جب کہ راقم الحروف لیبیا جاتے ہوئے ۳۶ گھنٹہ کے لئے روم (اٹلی) میں ٹھہرا تھا۔ روم کی یادوں میں سے ایک یاد وہ جرمن پادری ہے جس سے وہاں میری ملاقات ہوئی:

```
Dr. Hans Georg Asmussen
P r o p s t
Beselerstraße 28-2240 Heide
Telefon (0481) 3220
W. Germany.
```

ایک موقع پر میں نے دیکھا کہ موصوف عربی انجیل کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سے میں نے سمجھا کہ وہ عربی زبان جانتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مجھے بائبل اور اس سے متعلقہ لٹریچر کے مطالعہ کا شوق ہے۔ میرے پاس انگریزی میں چھپی ہوئی چیزیں موجود ہیں۔ مگر میں بائبل کا مکمل عربی ترجمہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

میرا مقصد صرف ناشر کا پتہ پوچھنا تھا تاکہ وہاں سے عربی بائبل منگائی جا سکے۔ مگر پادری موصوف نے ناشر کا پتہ بتانے کے بجائے خود میرا پتہ دریافت کیا اور اپنی ڈائری میں میرا پتہ نوٹ کرتے ہوئے کہا: میں آپ کو عربی بائبل بھجواؤں گا۔

اس واقعہ کو تقریباً ایک برس گزر چکا تھا اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ پادری صاحب یا تو اپنا وعدہ بھول گئے یا انھوں نے کتاب روانہ کی اور وہ کسی وجہ سے مجھ تک نہیں پہنچی۔ مگر فروری ۱۹۷۷ کی ایک تاریخ کو ڈاک میں ایک پیکٹ ملا۔ کھولا تو اس کے اندر پرانے اور نئے عہد نامہ پر مشتمل "الکتاب المقدس" کا ایک نیا نسخہ موجود تھا۔ فولڈنگ جلد کے ساتھ بائبل پیپر پر چھپا ہوا یہ خوبصورت نسخہ ۱۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ روانگی میں تاخیر کا امکانی سبب کیا تھا۔ پرنٹ لائن کے مطابق بائبل کا یہ عربی نسخہ کوریا میں ابھی ۱۹۷۶ میں چھپا ہے۔ غالباً پادری موصوف کے پاس یا ان کے ادارہ میں عربی نسخے ختم ہو گئے تھے اور جب کوریا سے چھپ کر وہ انھیں پہنچے ہیں تو حسب وعدہ انھوں نے فوراً اس کی روانگی کا انتظام کیا۔

پادری موصوف کے نام جب میں نے شکریہ کا خط روانہ کیا تو خیال آیا کہ کاش ہم بھی اسی طرح "شکریہ کے خطوط" وصول کرنے کی پوزیشن میں ہوتے۔ آج ساری دنیا میں بے شمار لوگ ہیں جو قرآن کو اپنی زبان میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر ہم ان کو قرآن کے ترجمے ان کی زبان میں اس طرح فراہم نہیں کر سکتے جس طرح مسیحی حضرات دنیا کی تمام زبانوں میں اپنی مقدس کتاب کو

دوسروں تک پہنچا رہے ہیں۔

قرآن کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بنی آدم کی طرف خدا کے آخری منذر (آگاہ کرنے والے) تھے۔ آپ نے قرآن کے ذریعے انذار کی یہ ذمہ داری ادا فرمائی اور اپنے بعد کتاب اللہ کو محفوظ حالت میں چھوڑ گئے کہ وہ قیامت تک لوگوں کے لئے آگاہی کا ذریعہ بنتی رہے۔

آپ کے بعد یہ قرآن کس طرح لوگوں تک پہنچے گا۔ اس کا ذریعہ امت محمدی ہے۔ امت محمدی کی پہلی اور لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن کی آواز کو تمام اقوام عالم تک پہنچائے۔ مگر افسوس کہ آج ساری دنیا میں کوئی بھی ادارہ خاص اس مقصد کے لئے قائم نہیں۔ حتیٰ کہ مسلمان اپنی اس ذمہ داری کے شعور تک سے غافل ہو چکے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو یہ کہا تھا کہ میں "بنی اسرائیل کی کھوئی بھیڑوں" کے پاس بھیجا گیا ہوں، مگر آپ کے پیروؤں کے جوش تبلیغ نے مسیحیت کو ساری دنیا کے لئے قابل مطالعہ بنا دیا۔ اس کے برعکس پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح لفظوں میں اعلان فرمایا کہ میری بعثت سارے عالم کے لئے ہے مگر آپ کے پیروؤں کے اندر یہ آگ نہیں بھڑکتی کہ آپ کے پیغام کو سارے عالم تک پہنچائیں —— جرمن پادری کی طرف سے میں نے عربی بائبل کا نسخہ وصول کیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زبان حال سے کہہ رہا ہو: "دیکھو تم اسلام کا پیغام پھیلانے میں ناکام رہ گئے اور ہم ساری دنیا میں مسیحیت کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔"

وحید الدین خاں (پیدائش ۱۹۲۵)
جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

مولانا اخلاق حسین قاسمی

ایک نصیحت

قوموں کی قسمت خود اپنے کردار سے بنتی ہے۔ کسی بھی پارٹی کے ساتھ لگ جائیے، کسی کے جھنڈے اٹھائیے، اس سے کچھ نہیں بنتا۔ ہمارے رہنما کچے پکے مکانوں پر بلڈوزر چلانے کا ماتم کر رہے ہیں، لیکن ان کو یہ نظر نہیں آرہا ہے کہ جس قوم کے اخلاق کی عمارت بوسیدہ ہو جاتی ہے، اس پر کوئی رحم نہیں کرتا۔ اس پر قدرت کا بلڈوزر چلتا ہی ہے۔

ہمارے اسلاف نے بوسیدہ مکانوں میں رہ کر دلوں پر حکمرانی کی، اور آج ہم فلک بوس عمارتوں میں رہ کر بھی محکوم اور غلام ہیں۔ یہ صرف اخلاقی بلندی اور پستی کا فرق ہے۔ دل کی بھڑاس نکال لیجئے۔ لیکن اس کی قیمت بہت بڑی چکانی پڑے گی۔

جو لوگ اعصابی اور مغلوب الغضب ہوں ان کے لئے میدان سیاست کا کارزار کسی طرح موزوں نہیں یہ تو وہ میدان ہے جہاں بے پناہ قوت برداشت ضرورت ہے۔

اِس پارٹی کی فتح ہو یا اُس پارٹی کی۔ اگر ہمارے اخلاق کا حال یہی ہے تو ہم شکست کھا گئے۔ کوئی آئے اور کوئی جائے، لیکن یہ ملت ہندستان میں ماتم ہی کرتی رہے گی:

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

روداد سفر

دسمبر ۱۹۷۶ کے آخری ہفتہ میں میوات (ہریانہ) کے چند مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا: بھادس، برکلی، پنگواں، نیم کھیڑا، بڈیڈہ اور فیروز پور جھرکا۔ ۲۰ دسمبر کی شب نیم کھیڑا (ضلع گوڑگاؤں) میں گزری۔ یہاں گاؤں کے کنارے اونچائی پر ایک مسجد ہے، جس کے شمالی جانب کشادہ، صاف ستھرا کمرہ بنا ہوا ہے۔ یہاں مسجد میں نماز عشاء کے بعد ایک تذکیری مجلس ہوئی جس میں راقم الحروف نے بعض احادیث کی روشنی میں بتایا کہ اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی تقویٰ کی رسی میں بندھ جائے۔ وہ ہر معاملہ میں بس وہیں تک جائے جہاں تک حدود اللہ اس کو اجازت دیتی ہوں۔ اس کے آگے اس کا ایمان اور خوف آخرت اس کو روک لے۔

مولانا عبد الرحیم بڈیڈوی اس مسجد میں امام اور مدرس کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ گاؤں کے بچے قرآن اور دینی تعلیم کے لئے یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے مل کر پڑھنے سے ایک قسم کا تعلیمی نغمہ مسجد کی فضا میں گونجتا رہتا ہے۔ گاؤں کے لوگ ملنے کے لئے کمرہ میں آتے رہے اور اس طرح گاؤں کے لوگوں سے دینی ربط جاری رہا۔ خاص طور پر جناب شمس الدین صاحب اور ان کے اہل خاندان سے جن کا مکان مسجد سے بالکل ملا ہوا ہے۔

کمرہ کا جائے وقوع ایسا ہے کہ صبح کو سورج نکلتے ہی دھوپ کمرہ کے اندر آگئی۔ سردی کے موسم میں صبح صبح چمکتا ہوا سورج جب اپنی سنہری کرنوں کے ساتھ ہماری قیامگاہ کے اندر داخل ہوا تو ایسا محسوس ہوا گویا زمین والوں کے ساتھ ہم "آسمان والوں سے" بھی مربوط ہو گئے ہیں۔ مسجد کے باہر پھیلے ہوئے ہرے ہرے کھیت، ان میں جگہ جگہ کھڑے ہوئے درخت دور آسمان کو چھوتی ہوئی پہاڑ کی دیواریں ان قدرتی مناظر کے درمیان چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں، اس ماحول میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے خالق اپنی مخلوقات کے پورے کارخانے کے ساتھ ہماری پشت پر آکر کھڑا ہو گیا ہے — شہری زندگی میں آدمی تمدن کی مصنوعی حدبندیوں میں گم رہتا ہے، مگر شہروں کے باہر قدرت کی جو پھیلی ہوئی دنیا ہے، وہاں اپنے کو پہنچا دیجئے تو زندگی اپنی تمام تنگیوں کے باوجود وسیع معلوم ہونے لگتی ہے۔ آدمی اپنے کو ایک آفاقی مملکت کا شہری سمجھنے لگتا ہے۔

شہر کے تمدنی بندھنوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک ایسے جال میں پھنسا ہوا ہے جس سے رہائی ممکن نہیں۔ مگر دیہات کی کھلی فضا جہاں ہریالی، میدان، چڑیوں کے چہچہے، پہاڑوں کی بلندیاں انسان کا استقبال کر رہی ہوں، جہاں آسمان کی وسعتیں خدا کی قدرت کو یاد دلاتی ہوں، زندگی کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ یہاں تنگیاں وسعتوں میں تحلیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انسانوں کے پیدا کئے ہوئے مسائل خدائی عظمتوں کے آگے حقیر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کی تاریکیاں کائنات کی تابناکیوں میں غائب ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آدمی، انسان کے بنائے ہوئے وحشت کدہ سے نکل کر خدا کی پرسکون دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ یہاں آکر زندگی کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔

مگر کیسی عجیب بدقسمتی ہے کہ لوگوں کو ان حقائق کا شعور نہیں۔ وہ خدا کے پڑوس میں ہو کر بھی انسان کی بنائی ہوئی دنیاؤں میں گم رہتے ہیں۔ آسمان کی فضاؤں سے انھیں اپنی غذا نہیں ملتی۔ چڑیوں کے زمزمے میں انھیں کوئی پیغام سنائی نہیں دیتا۔ درختوں کی ہریالی میں انھیں زندگی کا کوئی سبق نہیں ملتا۔ پہاڑوں کی بلندی میں ان کے لئے نصیحت کا کوئی سامان نہیں ہے۔ وہ صرف انسانوں کی آواز سن سکتے ہیں۔ خدا اور فرشتوں کی آواز سننے کے لئے ان کے کان بہرے ہیں۔ خدا اپنی پوری کائنات کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا ہوا ہے، مگر ان کی آنکھیں صرف انسانی مصنوعات کو دیکھ سکتی ہیں۔ خدائی کارخانہ کو دیکھنے کی صلاحیت ان کے اندر نہیں۔ خدا یہاں پہاڑ کی بلندیوں اور آسمان کی وسعتوں سے اعلان کر رہا ہے کہ: "میرے سایہ میں آجاؤ، میرا جوا نرم ہے اور میرا بوجھ ہلکا"۔ مگر کوئی نہیں جو اس ربانی پیغام سے آشنا ہو۔

مسجد اور گاؤں میں کچھ لمحات گزارنے کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ قرآن کی آیت وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ کا مطلب کیا ہے۔ یعنی حالات جب اہل ایمان کو اتنا پیچھے دھکیل دیں کہ عملاً ان کے لئے گھر اور مسجد کے سوا کوئی اور میدان کار باقی نہ رہے تو انھیں چاہئے کہ اسی ملے ہوئے دائرے کو اپنے عمل کے لئے خاص کرلیں۔ خارجی دنیا کے خلاف شکایت اور احتجاج کا میمورنڈم مرتب کرنے میں وہ اپنا وقت ضائع نہ کریں بلکہ گھروں اور مسجدوں کو مرکز بنا کر ایک طرف اپنے رب کے ساتھ اور دوسری طرف اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ جڑ جائیں اور جو دائرہ بھی ان کے لئے باقی رہ گیا ہے، اس کے اندر دینی بیداری کی کوشش جاری رکھیں۔

"میوات" کا لفظ باہر کے لوگوں کے لئے ایک افسانوی نام بن گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میو قوم، جس کے نام سے یہ علاقہ منسوب ہے، اس ملک کی سب سے زیادہ پچھڑی ہوئی قوم ہے۔ جگہ جگہ قدیم طرز کی درگاہوں کی بڑی بڑی عمارتیں بتاتی ہیں کہ یہ علاقہ سیکڑوں برس سے بزرگوں کی توجہات کا مرکز رہا ہے۔ ایک میو سلام کے بعد مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آپ کی طرف بڑھائے گا تو اس کے ہاتھ میں لٹکی ہوئی تسبیح بتائے گی کہ ان اصلاحی کاموں کے اثرات بھی اس قوم نے قبول کئے ہیں۔ مگر اوراد و نوافل سے اوپر حقیقی دینی تبدیلیاں شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتی ہیں۔

ہم گاؤں کے باہر نکلے تو حد نظر تک ہرے بھرے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ایک کھیت میں گیہوں کی فصل نہایت عمدہ کھڑی ہوئی تھی۔ "یہ کس کا کھیت ہے" میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا: "یہ رہن کا کھیت ہے جو ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان سے لیا ہے"۔ یہ سنتے ہی میری خوشی ختم ہوگئی۔ مجھے حدیث یاد آئی: کل لحم نبت من السحت فالنار اولی بہ (ہر جسم جو حرام سے پلے اس کے لئے آگ ہی بہتر ہے) تاہم اس علاقہ کے لئے یہ کوئی انوکھی مثال نہیں۔ "داڑھی اور تسبیح" والے اسلام کی کثرت کے باوجود یہاں اس قسم کی بے شمار خرابیاں عمومیت کے ساتھ جاری ہیں۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دنیوی عقل، جو آدمی کے گرد و پیش کے حالات خود اپنے زور پر اس کو سکھا دیتے ہیں، اس سے بھی یہ قوم ابھی تک خالی ہے۔

میو قوم ایک انتہائی برباد قوم ہے۔ اس کی بربادی

کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کو زمانہ کا شعور نہیں۔ میووں کے درمیان ایک مثل مشہور ہے :

جاٹ کہے سن جاٹنی یائی گاؤں میں رہنا
اونٹ بلیا لے گئی، ہاں جی ہاں جی کہنا

اس شعر میں جس مفاہمت اور حقیقت پسندی کا ذکر ہے، وہ میووں کے روایتی تصور میں دبی ہوئی قوموں کا طریقہ تھا۔ میووں کا خیال اپنے بارہ میں یہ رہا ہے کہ ہمیں دوسروں سے مفاہمت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، ان کی لاٹھی، ان کے نزدیک، اس قسم کی "بزدلی" کا بہترین بدل تھی۔ آج زندگی کے معنی بالکل بدل گئے مگر میو اب بھی انھیں روایتی تصورات اور رومانی خیالات میں جی رہے ہیں۔ آج بھی اگر کوئی معاملہ پیش آجائے تو وہ فوراً لڑنے بھڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، خواہ اس کا نتیجہ یہ کیوں نہ نکلے کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ برے حال کو پہنچا دیئے جائیں ــــ دین، اپنی حقیقی شکل میں، دنیا کا بھی شعور بیدار کرتا ہے اور آخرت کا بھی۔ مگر اس قابلِ رحم قوم کے حصہ میں ایک ایسا دین آیا ہے جس نے اس کو نہ دنیا کا صحیح شعور دیا اور نہ آخرت کا ــــ

آپ لکڑی کو توڑیں تو وہ دو ٹکڑے ہو کر رہ جائے گی۔ مگر ایک زندہ امیبا جب ٹوٹتا ہے تو وہ دو زندہ امیبا بن جاتا ہے ــــ

حقیقت یہ ہے کہ تقسیم اور شکست اس دنیا میں صرف مردہ چیزوں کے لئے مقدر ہیں۔ ایک چیز جو زندہ ہو، اس کو کبھی توڑا نہیں جاسکتا۔ زندہ چیز اگر ٹوٹتی ہے تو اس کا ہر حصہ ایک نئے زندہ وجود کی شکل اختیار کرلیتا ہے، اور پہلے سے بھی زیادہ عظیم بن جاتا ہے

مقاصد

۱- عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسائل کا اجراء جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی دعوتی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا جاسکے اور اسلام کو جدید اسلوب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدلل کیا جائے۔

۲- قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۳- قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت۔

۴- حدیث، سیرت، حالات صحابہ، تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات) پر سادہ، واقعاتی انداز میں کتابوں کی تیاری اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۵- ایسی درس گاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت تقابلی مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۶- اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل لائبریری کا قیام۔

۷- مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸- اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔

۹- علمی طرز فکر اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کرنا۔

۱۰- جدید طرز کے پریس کا قیام جہاں مختلف زبانوں میں اعلیٰ چھپائی ہو سکے۔

۱۱- ایسے ادارہ کی تشکیل جہاں تمام ضروری دینی شعبے قائم ہوں اور غیر مسلم وہاں آکر اسلام کو سمجھ سکیں۔

ضرورت ہے کہ اسلام
کو دنیوی مہم کے بجائے
اخروی مہم کے طور پر
سامنے لایا جائے

دعوت اسلامی ہی
ایک ایسا کام ہے جس
پر تمام مسلمانوں
کو
متحد کیا جا سکتا ہے

تعارف

سمندر میں برف کے بہت بڑے بڑے تودے ہوتے ہیں جن کو آئس برگ کہا جاتا ہے۔ ان برفانی پہاڑوں کا دس میں سے نو حصہ پانی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور صرف ایک حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ ایسی ہی کچھ مثال انسانی زندگی کی ہے۔ انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے دائمی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اور پھر اس کی زندگی کے نہایت مختصر حصہ ـــــ تقریباً سو سال ـــ کو موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ تمام عمر کو آخرت کی دنیا میں ڈال دیا۔

موت وہ دروازہ ہے جس سے ہم، اپنی موجودہ مدتِ حیات پوری کرنے کے بعد، دوسری دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ انسان کی کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کو اپنی زندگی بنائے۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے وسائل اور اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرے جو اس کی زندگی کے اگلے مرحلے کو بہتر بنانے والا ہو۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کے تمام کارنامے اسی دنیا میں رہ جائیں گے اور موت کے بعد دوسری دنیا میں وہ اس حال میں پہنچے گا کہ آخرت کی طویل تر زندگی میں اپنی جگہ بنانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ ہوگا۔

یہی وہ نازک مسئلہ ہے جس سے انسان کو باخبر کرنے کے لیے خدا نے پیغمبروں کا سلسلہ جاری کیا۔ ہر دور میں خدا کے نمائندے آئے اور آسمانی کتابیں اتاری گئیں تاکہ موت کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے انسان کو بتا دیا جائے کہ اس کو بالآخر کہاں جانا ہے۔ اور اپنی مستقل کامیابی کے لئے اسے کیا کرنا چاہیے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ تاہم جہاں تک پیغمبرانہ کام کا تعلق ہے، اس کی ضرورت بدستور باقی ہے۔ آج بھی یہ مطلوب ہے کہ خدا کے بندوں کو اس اہم ترین حقیقت سے باخبر کیا جائے تاکہ آخرت میں خدا کے اوپر کسی کی حجت باقی نہ رہے۔

خدا کے اس پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے اب کوئی پیغمبر آنے والا نہیں ہے۔ اب امت مسلمہ اس کی ذمہ دار ہے۔ خاتم النبیین کی امت کا اصل مشن دنیا میں یہی ہے کہ وہ اس پیغمبرانہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اٹھے۔ یہ اس کا ایسا ناگزیر فریضہ ہے جس سے غفلت کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتی۔

اسلامی مرکز کا قیام اس لئے عمل میں آیا ہے کہ امت مسلمہ کو اس کی اس ذمہ داری کی طرف متوجہ کرے اور تمام ممکن ذرائع سے حق کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔

پیغام رسانی کا یہ عظیم کام صرف اس وقت موثر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے جب کہ اس کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے مکمل تیاری کی جائے اور اس کے لئے تمام ضروری تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ اسلامی مرکز نے اس سلسلے میں اپنے سامنے جو نقشہ کار رکھا ہے، اس کو مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ اسلامی علوم کی تدوین

پہلا کام اسلام کے علوم کو عصری اسلوب میں

مدون کرنا ہے۔ اسلام ایک دائمی حقیقت ہے۔ مگر زمانہ کی اصطلاحیں اور اسلوب کلام بدلتے رہتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی تعلیمات اور رسول اور اصحاب رسول کی زندگیوں کے بارے میں جو لٹریچر پچھلے زمانوں میں تیار ہوا وہ انتہائی قیمتی ہے۔ اور ہمیشہ کے لیے اسلام کا علمی و فکری ماخذ ہے۔ تاہم ضرورت ہے کہ اس کو جدید سائنٹفک اسلوب میں مرتب کیا جائے تاکہ آج کے ذہن کے لئے وہ فکری غذا حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکے۔

۲- شاکلہ کو بدلنا

ہر دور کا ایک شاکلہ (طرز فکر) ہوتا ہے جس کے مطابق انسان سوچتا ہے اور مختلف مسائل میں رائے قائم کرتا ہے۔ قدیم زمانہ میں شرک کا شاکلہ دنیا میں رائج تھا۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھیوں نے طاقتور فکری سیلاب برپا کرکے اس شاکلہ کو توڑ دیا۔ یہاں تک کہ تاریخ ایک نئے رخ پر چل پڑی — اب دوبارہ الحاد کا شاکلہ دنیا بھر میں چھا گیا ہے۔ علم و عمل کے تمام شعبوں میں رائے قائم کرنے کے لیے غیر خدائی معیاروں کو برتری حاصل ہو گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ فکری اور عملی جدوجہد کے ذریعہ دوبارہ شاکلۂ الحاد کو توڑا جائے جس طرح ہمارے اسلاف نے شاکلۂ شرک کو توڑا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ ذہنی زمین بن سکتی ہے جب کہ خدا پرستانہ انداز فکر دوبارہ دنیا میں اپنی جگہ پا سکے۔

۳- اقتصادی و تمدنی استحکام

یہ دنیا مادی دنیا ہے، یہاں کوئی کام، خواہ وہ اپنی نوعیت میں خالص غیر مادی کیوں نہ ہو، مادی ذرائع کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ اہل اسلام اپنے اندر اقتصادی قوت اور تمدنی استحکام پیدا کریں تاکہ ان کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو موثر طور پر ادا کرنا ممکن ہو سکے

۴- جدید ضرورتوں کے مطابق اسلامی تعلیم

اسلامی تعلیم کا مقصد مسلم نسلوں کو وہ علم اور وہ شعور دینا ہے جس سے ایک طرف وہ اپنے دین کو اس کی اصل حیثیت میں سمجھیں۔ دوسری طرف وہ اس قابل ہوں کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کے اوپر اپنی دینی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں۔

ہمارے موجودہ تعلیمی ادارے دونوں ہی مقاصد کی تکمیل میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔ اول الذکر مقصد کے لیے جزوی طور پر اور ثانی الذکر کے لیے کلی طور پر ان کی غیر موزونیت واضح ہے۔ ضرورت ہے کہ از سر نو اسلامی تعلیم کا نہج بنایا جائے۔ اس کے بغیر وہ "علماء" پیدا نہیں ہو سکتے جو انبیاء بنی اسرائیل کی طرح امت کے نگہبان بن سکیں۔

۵- پریس کی طاقت کا استعمال

پریس کا مطلب ایک شخص کے تحریری کام کو کروروں سے ضرب دینا ہے۔ اس دریافت نے تاریخ میں پہلی بار ایک نیا امکان کھول دیا ہے۔ اس نے دعوت کے عمل کو مقامی پیغام رسانی کے دور سے نکال کر عالمی پیغام رسانی کے دور میں داخل کر دیا ہے اگر اس امکان کو اعلیٰ معیار کے مطابق بھرپور طور پر استعمال

کیا جائے تو سالوں کے اندر وہ کام انجام دیا جا سکتا
ہے جس کے لیے پہلے صدیاں درکار ہوتی تھیں۔

۶- افراد کی ذہنی تربیت

آج مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۸۵ کروڑ ہے
دنیا کے تمام انسان ایک قطار میں کھڑے کیے جائیں تو
ان میں سے ہر پانچواں شخص مسلمان ہوگا۔ ان مسلمانوں
کے اندر یہ شعور زندہ ہو کہ وہ دعوت حق کے امین ہیں
اور وہ اس امانت کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے
آواز لگائیں تو سارا عالم ان کی آواز سے گونج اٹھے۔
مگر اس کثرت کے باوجود خدا کا دین غیر اعلان شدہ
پڑا ہوا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر یہ شعور
نہیں کہ ان کی حیثیت داعی اور پیغام بر کی ہے۔ ضرورت
ہے کہ تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال کر کے مسلمانوں کے
اندر اس شعور کو زندہ کیا جائے۔ انھیں تیار کیا جائے
کہ وہ صاحب نظریہ افراد کی حیثیت سے اپنی پڑوسی
قوموں کے درمیان رہ سکیں۔

۷- مسلم قوموں کے اندر مقصدی یگانگت

دنیا بھر میں تقریباً تین درجن مسلم ممالک ہیں۔
اگر ان کے درمیان مقصدی یگانگت ہو تو دعوتِ
اسلامی کے کام کو انتہائی موثر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے
مگر اسلام کے نام پر سیاسی جھگڑے ان کو باہم قریب نہیں
ہونے دیتے۔ ضرورت ہے کہ ہر قسم کے مادی اور سیاسی
جھگڑوں سے اسلام کو الگ کر دیا جائے۔ اسلام کو دنیوی
مہم کے بجائے اخروی مہم کے طور پر سامنے لایا جائے۔ اس
طرح اندرونی طور پر جماعتوں اور حکومتوں اور بیرونی
طور پر مختلف مسلم قوموں کا باہمی ٹکراؤ ختم ہو جائے گا اور
اسلامی خدمت کی ایسی سطح وجود میں آئے گی جہاں ہر ایک
دوسرے کے ساتھ اتحاد و اشتراک کر سکے۔

۸- مرکز اسلامی کی تعمیر

اسلامی دعوت کا کام موجودہ زمانے میں ایک
عظیم الشان کام ہے۔ اس کو موثر طور پر انجام دینے کے لیے
ضروری ہے کہ وسیع پیمانہ پر ایک مرکز بنایا جائے جس میں
تمام ضروری شعبے قائم ہوں اور وہاں سے اس اہم کام کی
منصوبہ بندی کی جائے۔

یہ مرکز ان تمام کاموں کی تنظیم کرے گا جن کا اوپر
ذکر ہوا۔ نیز مختلف قسم کی علمی، عملی اور دعوتی سرگرمیوں کے
ذریعہ وہاں جو اسلامی ماحول بنے گا، وہ اس مقصد کے
حصول کا بھی مفید ذریعہ ہوگا کہ غیر مسلم افراد وہاں آکر اسلام
کا مطالعہ و مشاہدہ کریں۔ اور خدا کے دین کو قریب سے
دیکھ کر اس کے بارہ میں اپنے رویہ کا فیصلہ کریں۔

۹- ہماری مطبوعات

اسلامی مرکز نے اپنے منصوبہ کے پہلے مرحلہ کے
طور پر مختلف زبانوں میں مطبوعات کا سلسلہ شروع کیا ہے۔
مثلاً اسلامی علوم کی تدوین کے سلسلے میں تعلیمات قرآن اور
پیغمبر اسلام، تبدیلی شاکلہ کے سلسلے میں عقلیات اسلام،
اقتصادی شعور پیدا کرنے کے سلسلے میں مستقبل کی طرف، اسلامی
تعلیم کے سلسلے میں اسلام دور جدید میں، پریس کی طاقت
استعمال کرنے کے سلسلے میں ماہنامہ الرسالہ کا اجراء، ذہنی تربیت
کے سلسلے میں الاسلام، مسلم اقوام کے درمیان مقصدی یگانگت
پیدا کرنے کے سلسلے میں عربی، ترکی، اور انگریزی کتب و مضامین کی اشاعت وغیرہ

Single Copy Rs. 2.00

Regd. No. D (D) 532
REGD. R. N. No. 28822/76
APRIL – 1977

AL-RISALA MONTHLY

1036 KISHANGANJ, DELHI-110006 (INDIA)

محمد احمد پرنٹر پبلشر مسئول نے جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر "دفتر الرسالہ" ۱۰۳۶ کشن گنج دہلی سے شائع کیا